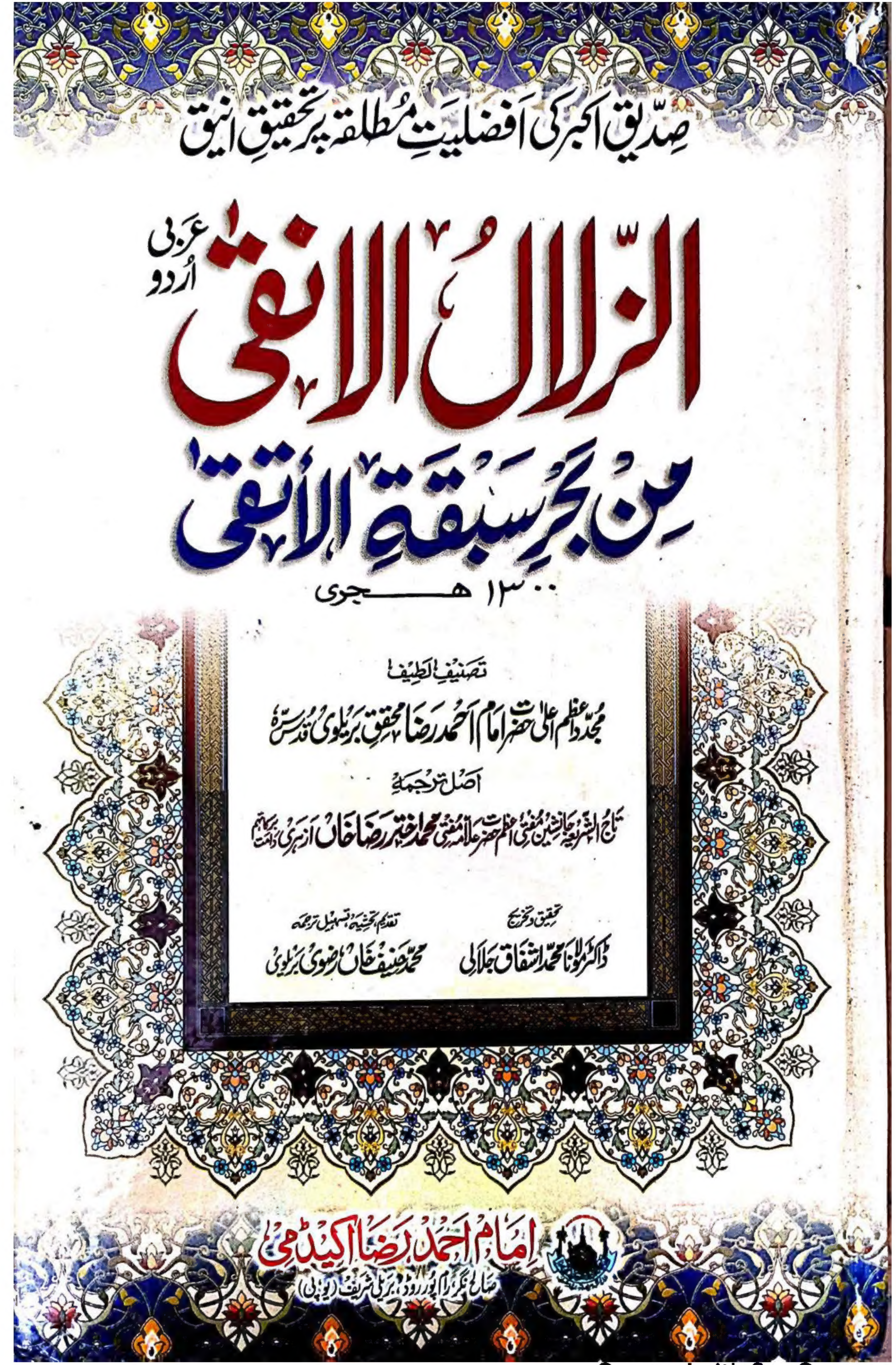


صدیق اکبر کی افضلیتِ مطلقہ پر تحقیقِ انیق
الزلال الانقی
عربی اردو
من بحر سبقۃ الاتقی
۱۳۰۰ ھجری
تصنیفِ لطیف
مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محقق بریلوی قدس سرہٗ
اصل ترجمہ
تاج الشریعہ جانشین مفتی اعظم حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم
تحقیق و تخریج
ڈاکٹر مولانا محمد اشفاق جلالی
تقدیم، تحشیہ، تسہیل ترجمہ
محمد حنیف خاں رضوی بریلوی
امام احمد رضا اکیڈمی
صالح نگر، رام پور روڈ، بریلی شریف (یوپی)

افضلیت صدیق اکبر کا تحقیقی بیان

الزلال الانقی

من بحر سبقۃ الاتقی

تصنیف لطیف

مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا

محدث بریلوی قدس سرہ

ناشر

امام احمد رضا اکیڈمی

صالح نگر بریلی شریف یو۔پی پن کوڈ:243502

سلسلۂ اشاعت..........................(۷۶)

نام کتاب...........................الزلال الانقی من بحر سبقة الاتقی

مصنف.............................مجدد اعظم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی

اصل ترجمہ........................تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی اختر رضا خاں ازہری

تسہیل ترجمہ، تقدیم، تحشیہ.........................محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

تخریج و تحقیق........................حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اشفاق جلالی (پاکستان)

کمپوزنگ..........................محمد منیف رضا خاں برکاتی

سیٹنگ...............................محمد نعیم نوری

صفحات.............................چار سو (۴۰۰)

سنہ اشاعت بار اول............................۱۴۳۵ھ/۲۰۱۳ء

تعداد..گیارہ سو/۱۱۰۰

E-mail:mohdhanif92@gmai.com

www.imamahmadrazaacademy.com

Rs. 180/-

تقسیم کار

☆ کتب خانہ امجدیہ ۴۲۵، مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۶

تقریظ جلیل

از
جانشین مفتی اعظم تاج الشریعہ
حضرت علامہ شاہ مفتی محمد اختر رضا خاں صاحب قبلہ قادری ازہری
دامت برکاتہم العالیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجھے یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت مولانا محمد حنیف خاں رضوی بریلوی زید مجدہ، اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے عربی شاہ کار "الزلال الأنقی من بحر سبقة الأتقی" کو میرے اردو ترجمے کے ساتھ جدید طباعت کے ساتھ شائع کرنے جا رہے ہیں، جس میں انھوں نے نصوص کی تخریج، ترجمے کی تسہیل اور تشریح طلب مقامات میں مختصر تشریح کا خاص اہتمام کرتے ہوئے کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق ایک تفصیلی مقدمہ بھی شروع میں تحریر کیا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی کوشش کو قبول فرمائے اور انھیں زیادہ سے زیادہ دین متین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ النبي الکریم. علیه وعلیٰ آله أفضل الصلاة وأکمل التسلیم.

محمد اختر رضا خاں قادری ازہری غفرلہ القوی
بریلی شریف، یوپی
١١ر صفر المظفر ١٤٣٥ھ/ مطابق ١٥ر دسمبر ٢٠١٣ء

TOKEN OF THANKS

This book would not have been possible to publish were it not for the financial help extended by the following individuals for the Isal al-Thawab of their beloved ones, namely Hazrat Peer Sayyid Noorani Baba Sahib Qibla 'alayhir Rahmah:

Members of Jama'at Raza-e-Mustafa, UK:

1. Hazrat Allama Muhammad Hanif Sahib Razawi – Chief head
2. Hazrat Allama Muhammad Iqbal Noori Misbahi
3. Hazrat Allama Muhammad Yunus Misbahi
4. Mawlana Muhammad Mohsin Razawi
5. Mawlana Muhammad Maqsud Misbahi
6. Mawlana Muhammad Nizamuddin Misbahi
7. Mawlana Muhammad Shafi' Nabipuri
8. Qazi Mushtaq
9. Mawlana Muhammad Ibrahim 'German' Misbahi
10. Hafiz Muhammad Nisar Sahib Gorji
11. Mawlana Muhammad Khayrud Din Noori
12. Qari Mahbub Sahib
13. Haji Shafiq Bhai Assuriyawala - Bolton

Also special thanks to all the below listed individuals for their continued generous support in all projects we have undertaken:

1. Hafiz Abdullah Thamwala
2. Haji Musa Bhai Natha
3. Haji Iqbal Bhai Manchwala
4. Haji Faruq Banglawala
5. Hafiz Maqsood Manchwala
6.

May Allah Most Exalted send the reward of this book to all their deceased [*marhum*] relatives, and may He grant them the loftiest station in *Jannah*...Ameen

عرض ناشر

زیر مطالعہ کتاب سب سے پہلے حضرت تاج الشریعہ مدظلہ الاقدس کے ترجمہ کے ساتھ مصلح قوم وملت حضرت علامہ مولانا عبدالمبین صاحب نعمانی کی نگرانی میں شائع ہوئی تھی، مگراس میں پروف کی غلطیاں بہت زیادہ رہ گئی تھیں جس کا اظہار خود نعمانی صاحب نے بھی کیا ہے، اس میں بہت کچھ دخل متعدد کاتبوں کو بھی رہا کہ ایک کتاب میں بدل بدل کر کاتب آتے رہے۔ بہرحال نعمانی صاحب نے مشکل مراحل سے گزار کر اس کو طبع کرادیا، پھراسی طرح اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوتے رہے، مگرکسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔

مطلع القمرین کی ترتیب جدید اور اس کی اولین طباعت کے بعد ہی خیر الاذکیا حضرت علامہ محمد احمد مصباحی نے فرمایا کہ: ''الزلال الانقی'' پر بھی کام ہوجائے تو اچھا ہے۔

اس فرمائش پر مجھے یاد آیا کہ پاکستان کے سفر میں فاضل جلیل حضرت مولانا ڈاکٹر محمد اشفاق جلالی صاحب نے ملاقات ہونے پر بتایا تھا کہ میں نے اس کتاب پر عربی زبان میں ڈاکٹریت کی ڈگری حاصل کرلی ہے، لہٰذا میں نے ان سے رابطہ کیا تو انھوں نے اپنی تحقیق وتخریج ارسال کردی۔ ڈاکٹر اشفاق جلالی صاحب نے کتاب کا مقابلہ سیدنا اعلیٰ حضرت کے اس نسخہ سے بھی کیا تھا جو فیصل آباد میں محدث اعظم پاکستان کی لائبریری میں ہے، مزید میں نے اور حضرت مصباحی صاحب قبلہ نے ''المجمع الاسلامی'' میں موجود مخطوطے سے بھی مقابلہ کیا، اس طرح قدیم ایڈیشن پر اس اشاعت میں بہت جگہ عبارات اور حواشی کا اضافہ ہوا ہے اور ان کا ترجمہ بھی۔ مزید عربی عبارات کی پیرابندی، کومہ، ڈش وغیرہ علامات ترقیم کی رعایت بھی حتی الامکان کی گئی ہے۔

ادھر حضرت تاج الشریعہ کا ترجمہ چوں کہ عالمانہ وفاضلانہ تھا اور اس کی بعض تعبیرات نہایت موزوں اور عمدہ ہونے کے ساتھ ادق تھیں جس سے عمومی افادہ واستفادہ کے لیے احباب نے مشورہ دیا کہ اس کی تسہیل وتوضیح ہوجائے تو اچھا رہے گا۔

لہٰذا راقم الحروف نے اس سلسلہ میں کوشش کی اور کافی محنت کے بعد ماہ رمضان کی تعطیل میں مکمل کردیا، اور حضرت مصباحی صاحب قبلہ کو نظر ثانی کے لیے بھیجا جس میں انھوں نے ضروری حذف واضافہ کے بعد فائنل کردیا، اس کے بعد راقم نے کچھ مقامات کی وضاحت کے لیے حاشیہ لکھا اور کتاب کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے ایک تقدیم اور بھرپوری کتاب کا خلاصہ، تاکہ قارئین کتاب سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔

ان تمام مراحل کے بعد یہ تمام چیزیں حضرت تاج الشریعہ کی خدمت میں پیش کیں اور عرض کیا کہ اجازت عطا فرمائیں تو اصل ترجمہ میں آپ کا اسم گرامی، اس کے علاوہ جس نے جو کیا ہے اس کی صراحت کردی جائے، حضرت نے خندہ پیشانی سے اس کی نہ صرف اجازت دی بلکہ بعض مقامات سن کر مسرت کا اظہار فرمایا اور دعائیہ کلمات کے ساتھ ایک تقریظ بھی لکھوا کر اپنے دستخط ثبت فرمادیے۔ مولیٰ تعالیٰ ہمارے ان بزرگوں کا سایہ ہم سب اہل سنت پر دراز فرمائے اور اس کتاب کے جملہ معاونین کی مساعی مشکور فرمائے، آمین بجاہ النبي الکریم ،علیه التحیة والتسلیم

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

تقدیم وخلاصۂ کتاب

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

روافض کا ظہور:

اہل اسلام کے درمیان افتراق وانتشار کی تخم ریزی کرنے والا بنام مسلمان سب سے پہلا
روافض کا ہے جس نے سب سے پہلے اپنا یہ عندیہ ظاہر کیا کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم
خلفائے ثلٰثہ سے افضل ہیں۔اس کے بعد خلافت بلافصل کے قائل ہوئے۔پھر اسی طرح حدود اسلام
پامال کرتے ہوئے ان میں کے بعض نے مولائے کائنات کی الوہیت کا بھی اظہار واعلان کردیا۔

ان تمام فریب کاروں اور فتنہ انگیزوں کا سرغنہ عبداللہ بن سبا یہودی یمنی صنعانی تھا جو بظاہر
اسلام کا لبادہ اوڑھے درپردہ مسلمانوں کے خون کا پیاسا اور افتراق بین المسلمین کا خواہاں رہا۔اس نے
اہل بیت نبوت کی محبت کا کچھ اس طرح اظہار کیا کہ بہت سے لوگ اس کے دام فریب میں آ گئے،چناں
چہ اس نے اپنی خصوصی مجالس میں لوگوں کو یہ ذہن دیا کہ حضرت علی مرتضیٰ کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ
وسلم کی جناب میں جو قرب حاصل تھا وہ کسی کو نہیں تھا،آپ بھائی بھی ہیں اور داماد رسول بھی،بلکہ حضور کے
وصی بھی ہیں،لہٰذا خلافت آپ ہی کا حق تھا مگر جو بااثر لوگ تھے انھوں نے ایکا کر کے ابوبکر وعمر اور پھر
عثمان کو خلیفہ بنا دیا اور اہل بیت کا یہ حق چھین لیا۔

یہ باتیں جب لوگوں میں پھیلیں تو اختلاف وانتشار کا بازار گرم ہوا،حضرت علی مرتضیٰ کو جب یہ
تمام خبریں پہنچیں تو آپ نے برسرمنبر ان تمام باتوں سے اپنی بےزاری کا اعلان فرمایا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ
فرمائی کہ جس کو ایسا کہتے سنوں گا اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا۔اس وعید شدید کے سبب یہ فتنہ دبا تو رہا
مگر ختم نہ ہوا،حتی کہ خود ان فتنہ پردازوں میں مختلف ٹولیاں ہوگئیں اور بڑھتے بڑھتے یہ لوگ خود ہی درجنوں
خانوں میں بٹ گئے۔حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب ''تحفۂ
اثنا عشریہ'' میں ان کے ستر سے زیادہ فرقوں کا تذکرہ کیا ہے۔مگر اصل الاصول ان کے تین فرقے ہیں:

(۱)فرقہ شیعہ تفضیلیہ (۲)فرقہ شیعہ سبیہ (تبرائیہ) (۳)فرقہ شیعہ غلات

اوران سب کے مقابلہ میں ''شیعہ اولیٰ'' یا ''شیعہ مخلصین'' کے نام سے جس جماعت کو موسوم کیا گیا تھا وہ اہل سنت و جماعت ہیں کہ اس زمانہ میں اسی نام سے شہرت تھی۔ اس لیے کہ اہل بیت نبوت سے سچی الفت ومحبت ان سب کے مقابلہ میں اہل سنت ہی کو تھی اور آج بھی ایسا ہی ہے۔

غرض کہ فرقہ تفضیلیہ جو حضرت علی کو حضرت ابوبکر صدیق سے بھی افضل قرار دیتا تھا یہی سب سے پہلا گروہ ہے کہ ابن سبا کی ذہنی تخریب کاری کے نتیجہ میں رونما ہوا۔ (۱)

ھندوستان میں جس طرح اہل تشیع کے دوسرے فرقے درآمد ہوئے اسی طرح یہ گروہ بھی آیا اور اس کا شکار بہت سے پڑھے لکھے لوگ بھی ہوئے، جیسا کہ اس کے آغاز میں بھی بہت سے ارباب علم اس کا شکار رہے تھے، اور بعض مقامات پر سادات نے بھی اس مذہب کو اپنا لیا، غالباً اس میں خاندانی ترجیحات کو دخل رہا۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ کے دور شباب میں بریلی اور اس کے قریبی شہروں مثلاً بدایوں، سنبھل وغیرہ میں بھی بہت سے لوگ تفضیلی گروہ کے عقائد کی طرف مائل ہو گئے تھے، ان میں بہت سے ذی علم بھی تھے، شیخین کی افضلیت کے سلسلہ میں کہتے تھے کہ ان کو سیاست وخلافت اور حکومت وسلطنت جیسے ظاہری امور میں تو برتری حاصل تھی، مگر باطنی امور مثلاً قرب الٰہی و کرامت عند اللہ میں امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو شیخین پر فوقیت حاصل تھی۔ بلکہ ان عقائد کے بارے میں عوام اہل سنت و جماعت کو یہ فریب بھی دیتے تھے کہ افضلیت کے یہ معنی جو ہم بیان کرتے ہیں یہی عقیدہ اساطین ملت اور علمائے اہل سنت کا قدیم سے چلا آرہا ہے۔ ارباب طریقت، اصحاب سیادت اور اہل بیت نبوت کے مشائخ بھی اسی طرف ہیں۔ مگر ان کے اس دجل اور مکر وفریب کا پردہ اس وقت چاک ہو گیا جب اہل بیت نبوت کے ایک شیخ اور گل سرسبد نے اپنی تحقیقات عالیہ سے امت مسلمہ کو سرفراز فرمایا۔

حضرت مولانا محمد شاہ قادری فیاضی بریلوی تلمیذ اعلیٰ حضرت رسالہ ''فتح خیبر'' میں لکھتے ہیں:

حق سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کہ اس نے حضرات (تفضیلیہ) کی اس خلط ملط کو بچا نہ رکھا اور علمائے دین کی سعی مشکور سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دکھایا۔ حضور پرنور غوث الاسلام والمسلمین حجۃ

(۱) (فارسی سے ترجمہ ملخصاً ص ۲: تحفۂ اثنا عشریہ، رئیس المحدثین حضرت علامہ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی)

اللہ فی الارضین طراز دامن شریعت بہار گلشن حقیقت جامع فضائل معنوی وصوری حضرت سیدنا ومولانا سید ابوالحسین احمد نوری میاں صاحب قادری برکاتی احمدی آل رسولی مارہروی تاجدار سرکار مارہرہ منورہ أدام اللّٰہ تعالیٰ ظلال جلالھم علینا نے رسالہ "دلیل الیقین من کلمات العارفین" میں اقوال اولیائے سلف واصفیائے خلف جمع فرماکر مذہب حق پر عرش تحقیق مستقر فرمایا۔ اور عامی جاہلوں کا وہ خیال ضلال کہ معاذ اللہ ائمہ طریقت برخلاف اہل سنت قرب الہ وکرامت جاہ میں تفضیل حضرات شیخین نہیں مانتے یکسر مٹایا اور حضرت استاذنا وملاذنا عالم دقیق النظر فاضل سنیت پرور نونہال دودمان فضائل فاضل ابن فاضل ابن فاضل حضرت مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب قادری برکاتی احمدی رسولی بریلوی دام بالعزوالمجدد و الرشد وصین من شر حاسد اذا حسد نے خاص اپنی تحقیقات رائقہ و تدقیقات فائقہ سے ایک سفر عظیم وکتاب ضخیم تصنیف فرمائی جس کی لطافت مبانی ومتانت معانی وناز کی تدقیق وتازگی تحقیق دیکھ کر مخالف منصف بھی انشاء اللہ تعالیٰ بے ساختہ پکار کر اٹھے کہ: لا عطر بعد عروس۔ ع: کم ترک الأول للاٰخر۔ ع: ذوق ایں مے نہ شناسی تانہ چشی

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یشاء واللہ ذو الفضل العظیم﴾(۱)

سیدنا اعلیٰ حضرت نے جب سیف اللہ المسلول حضرت علامہ مولانا فضل رسول بدایونی کی شان میں دو قصیدے (قصیدۂ نونیہ: ۲۴۳/ اشعار، قصیدۂ دالیہ: ۷۰/ اشعار) پر مشتمل نظم فرمائے تو ان میں بھی چند اشعار تفضیلی گروہ کے اساطین کی تردید میں قلم بند کیے۔ قصائد کے ترجمہ وتشریح میں مولانا عاصم اقبال مجیدی بدایونی ان اشعار کی توضیح کے تعلق سے لکھتے ہیں:

تیرھویں صدی کی آخری دھائی اور چودھویں صدی کی پہلی دھائی میں بدایوں اور بریلی میں ایک طبقہ تفضیلی عقائد کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ بریلی میں شاہ نیاز احمد بریلوی کے صاحب زادے شاہ نظام الدین نیازی بریلوی (صاحب سجادہ خانقاہ نیازیہ بریلی) بدایوں میں ان کے بھائی شاہ نصیر الدین چشتی نیازی اور شاہ دلدار علی مذاق میاں اس طبقہ کے علم بردار تھے۔ اس کے مقابلہ میں حضرت تاج الفحول اور آپ کے تلامذہ نے کامیاب تحریری وتقریری جدوجہد فرمائی، حضرت تاج الفحول نے رسالہ رد روافض، ہدایت الاسلام، تصحیح العقیدہ فی باب امیر معاویہ اور اظہار الحق وغیرہ اسی زمانے میں تالیف فرمائے تھے۔ بریلی میں اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی

(۱) رسالہ فتح خیبر، (اعلیٰ حضرت اور گروہ تفضیلیہ کے درمیان مناظرہ بریلی کی روداد)

نے تحریراً اور تقریراً اس طبقہ کا رد کیا، آپ نے "منتهى التفصيل لمبحث التفضيل مطلع القمرين في ابانة سبقة العمرين، الزلال الأنقى من بحر سبقة الأتقى، رفع العروش الخاوية من أدب الأمير المعاوية" وغیرہ رسائل اسی زمانہ میں اس طبقہ تفضیلیہ کے رد میں تصنیف فرمائے۔ اس طبقہ کی جانب سے دو حضرات بہت پیش پیش تھے ایک مولانا محمد حسن سنبھلی دوسرے مولوی علی احمد مذنب بدایونی، یہ دونوں شاہ مذاق میاں کے مریدین میں تھے۔ اول الذکر نے بریلی میں اعلیٰ حضرت کو مسئلہ تفضیلیت پر مناظرے کا چیلنج کیا، فاضل بریلوی نے فوراً تمیں سوال قلم بند فرما کر بھیجے، ان سوالات کو دیکھ کر ایسی ابتری پھیلی کہ میدان چھوڑ کر بھاگتے ہی بنی۔ ثانی الذکر مولوی مذنب بدایونی نے رسالہ "تحفۃ الاخیار، تحقیق القول الجید" تالیف کیے، جس کے جواب میں بالترتیب "تنبیہ ملحدین الاشرار، تادیب المذنب البلید" تصنیف کیے گئے۔

آپ شاہ نظام الدین بریلوی، شاہ نصیر الدین نیازی، شاہ دلدار علی مذاق، مولانا محمد حسن سنبھلی اور مولوی علی احمد مذنب بدایونی کے نام اور کرداروں کو ذہن میں رکھ کر اب شعر ۱۵۵ میں نصیر دین الحق اور نظام دین اللہ، شعر ۱۵۶ میں مذنب اور مذاق اور شعر ۱۵۷ میں سنبلی کے لفظوں پر غور فرمائیں تو نہ صرف یہ کہ اشعار کا لطف دوبالا ہو جائے گا بلکہ شاعر کے تفنن طبع اور قادر الکلامی پر بے ساختہ منہ سے سبحان اللہ نکل جائے گا۔

فَنَصِيرُ دِيْنِ الْحَقِّ لَيْسَ بِفَاجِرٍ وَنِظَامُ دِيْنِ اللّٰهِ غَيْرُ دَدَانِ

تو دین حق کا معین و مددگار فاجر نہیں ہوتا اور اللہ کے دین کا نظام بے ہودہ (لوگ) نہیں ہوتے۔

مَامُذْنِبٌ يَحْلُو لَدَيْهِ مَذَاقُهُمْ اِلَّا اُذِيْقَ مِنَ الْحَمِيْمِ الْاٰنِي

کسی گنہ گار کے نزدیک بھی ان کا مشرب شیریں نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے بھی بالکل ایسا ہے جیسے سخت گرم پانی پلایا جا رہا ہو۔

لَا يَقْتَفِيْهِمْ سُنْبُلِيٌّ اَوْشِنَا نِيٌّ فَيَنْجُ بِسَنْبَلٍ وَ شِنَانِ

ان کی پیروی کوئی سنبلی (رومی) اور شنانی (شامی) نہیں کرے گا، کہ مقام سنبل اور شنان میں ہی نجات پائے۔ (۱)

اس سلسلہ کا ایک واقعہ ملک العلما حضرت علامہ ظفر الدین بہاری نے یوں تحریر فرمایا ہے:

بقول سید ایوب علی رضوی ماہ جمادی الآخرہ ۱۳۰۰ھ میں مفصلہ بریلی، بدایوں، سنبھل، رام پور

(۱) قصیدتان رائعتان، ص: ۱۹۱، ۱۹۲، مطبوعہ تاج الفحول اکیڈمی بدایوں۔

وغیرہ نے متفقہ طریقے سے مسئلہ تفضیل میں اعلیٰ حضرت سے مناظرہ کا اعلان کیا اور سب نے مولانا مولوی محمد حسن سنبھلی مصنف ''تنسیق النظام فی مسند الامام'' و'' حاشیہ ہدایہ'' وغیرہ کو امیر جماعت ومناظر مقرر کیا اور بریلی پہنچے۔اس زمانے میں اعلیٰ حضرت منضج پی رہے تھے اور جلاب کے دن قریب تھے،ایک نئے طبیب کے زیر علاج تھے۔اس کی سازش سے یہ مشورہ ہوا کہ مسہل کے ایک دن قبل دعوت مناظرہ دینی چاہیے،اعلیٰ حضرت بوجہ مسہل خود ہی انکار کردیں گے اور ہمت کی بھی تو طبیب کی حیثیت سے وہ معالج منع کردیں گے۔بات بن جائے گی کہ مناظرہ سے فرار کیا،لیکن جسے خداوند عالم سربلند کرے اسے کون نیچا دکھا سکتا ہے۔اعلیٰ حضرت نے فوراً چیلنج مناظرے کا منظور فرمایا۔معالج صاحب نے بہت منع کیا کہ کل مسہل کا دن ہے،اعلیٰ حضرت نے فرمایا:مناظرہ کرتے ہوئے مجھے مرجانا منظور ہے مگر مناظرے سے انکار کرکے بچنا منظور نہیں۔آخر اسی حالت میں آپ نے تیس سوال لکھ کر سرگروہ جماعت جناب مولانا محمد حسن صاحب سنبھلی کے پاس روانہ کردیئے۔مولانا موصوف کی دیانت کہ بہ مجرد سوالات دیکھنے کے فرمایا:ان سوالات کا جواب کوئی شخص تفضیلی عقیدہ رکھتے ہوئے نہیں دے سکتا۔اور اسی وقت ریل میں سوار ہوکر مکان تشریف لے آئے۔اس کے بعد''شرح عقائد'' کا حاشیہ مسمّٰی بہ''نظم الفرائد ''تحریر فرمایا جس میں مذہب اہل سنت وجماعت کی حمایت وتائید کی۔دوسرے معاونین نے یہ حال دیکھ کر ''من سکت سلم'' پر عمل کیا اور بالکل خاموشی اختیار کی۔جس کی قدرے تفصیل رسالہ''فتح خیبر''(۱) میں اسی زمانے میں مطبوع ہوچکی ہے۔اس کے بعد اعلیٰ حضرت نے کئی مرتبہ لوگوں کو دعوت مناظرہ دی مگر ادھر سے صدائے برنخاست۔ذلک فضل اللّٰہ یؤتیہ من یشاء واللّٰہ ذو الفضل العظیم۔(۲)

یہی وجہ ہے کہ سیدنا اعلیٰ حضرت نے سب سے پہلے تفضیلیہ کے رد کی طرف اپنی توجہ مبذول فرمائی۔زیر مطالعہ کتاب اسی سلسلہ کی کڑی ہے،کتاب کی تصنیف کے وقت آپ کی عمر اٹھائیس سال دو ماہ کم وبیش ۲۰ ردن ہے۔اس لیے کہ آپ نے یہ کتاب ذوالحجہ ۱۳۰۰ھ کے آخری پانچ ایام میں لکھی اور ۱۳۰۰ھ کی آخری شب میں اختتام کو پہنچی اور آپ کی ولادت ۱۰ رشوال ۱۲۷۲ھ میں ہوئی۔

کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:ولما کان فَضُّ خِتامِها ، وطلوعُ بَدر تمامها لِلیلةٍ ،

---

(۱) رسالہ''فتح خیبر'' کتاب کے آخر میں ملاحظہ کریں،مکمل رسالہ شامل اشاعت ہے۔
(۲) حیات اعلیٰ حضرت:۱/۶۳،طبع جدید امام احمد رضا اکیڈمی بریلی شریف

بَقِيَت مِنَ المِئَة الثالثة عشر من سِني هجرةِ سَيِّدِ البَشَر عليه من الصلواتِ أنماها و من التَّحِيَّاتِ أز كاها۔ ناسب أن أسمِيها "الزّلال الأنقىٰ من بحر سبقة الأتقىٰ" ليكونَ العَلَمُ عَلَماً علَى العام، والله تعالىٰ وليُّ الإنعام، وهو الخامس عشر من تصانيفي في علوم الدين۔

چوں کہ اس کتاب کے اختتام کی مہر اس رات میں لگی اور اس کا ماہ تمام اس رات طلوع ہوا جو تیرھویں صدی ہجری (۱۳۰۰ھ) کی آخری رات تھی، لہذا اس مناسبت سے میں نے اس کا تاریخی نام "**الزلال الانقیٰ من بحر سبقة الاتقی**" رکھا، (یعنی سبقت اَتقی کے سمندر سے انتہائی پاکیزہ آبِ خوش گوار) تاکہ یہ نام تصنیف کے سال کی نشانی ہو جائے، اللہ تعالیٰ ہی ولی نعمت ہے۔ کتب دینیہ میں یہ میری پندرھویں تصنیف ہے۔

جس شب میں کتاب اختتام کو پہنچی وہ شب گزار کر ذوالحجہ ۱۳۰۰ھ کا آخری دن آیا تو اس دن شام کو اعلیٰ حضرت سے متعلق ایک عظیم واقعہ رونما ہوا، جو انصاف پسند اور عقیدت مند قارئین کے لیے فرحت وانبساط کا موجب ہوگا، لہذا تحریر کیا جاتا ہے:

شہزادۂ استاذ زمن حضرت علامہ حسنین رضا خاں بریلوی لکھتے ہیں:

اعلیٰ حضرت قبلہ کے فیضان مجددیت کا ظہور ۱۳۰۱ھ کے آغاز سے ہوا۔ یہ واقعہ ذرا تفصیل طلب ہے: واقعہ یہ ہے کہ ہمارے چچا مولوی محمد شاہ خاں صاحب عرف تھن خاں صاحب مرحوم سوداگری محلہ کے قدیمی باشندے تھے، اعلیٰ حضرت سے عمر میں ایک سال بڑے تھے، بچپن ساتھ گزرا، ہوش سنبھالا تو ایک ہی جگہ نشست و برخاست رہی، ایسی حالت میں آپس میں بے تکلفی ہونا ہی تھی۔ ان کو اعلیٰ حضرت قبلہ تھن بھائی جان کہتے تھے اور ان کے ایک سال بڑے ہونے کا بڑا لحاظ فرماتے تھے۔ یہ بھی اکثر سفر و حضر میں ساتھ ہی رہتے۔ آدمی ذی علم تھے۔ گھر کے خوش حال زمیں دار تھے۔ یہاں تک کہ ندوہ کے مقابلہ میں جب اعلیٰ حضرت قبلہ نے بہار و کلکتہ کا سفر کیا تھا تو تھن میاں بھی ساتھ رہے۔ میں نے اپنے ہوش سے انھیں اعلیٰ حضرت قبلہ کی صحبت میں خاموش اور مؤدب ہی بیٹھے دیکھا۔ انھیں اگر مسئلہ دریافت کرنا ہوتا تو دوسروں کے ذریعہ سے دریافت کراتے۔ میں مدتوں سے یہ ہی دیکھ رہا تھا۔ ایک روز میں نے چچا سے عرض کیا کہ اعلیٰ حضرت تو آپ کی بزرگی کا لحاظ کرتے ہیں۔ آپ ان سے اس قدر کیوں جھجکتے ہیں کہ مسئلہ خود نہیں دریافت کرسکتے۔ انھوں نے فرمایا: کہ ہم اور وہ بچپن سے ساتھ رہے۔ ہوش سنبھالا تو نشست و برخاست ایک ہی جگہ ہوتی۔ نماز مغرب پڑھ

کر ہمارا معمول تھا کہ ان کی نشست میں آبیٹھتے۔ سید محمود شاہ صاحب وغیرہ چند ایسے احباب تھے کہ وہ بھی اس صحبت کی روزانہ شرکت کرتے۔ عشا تک مجلس گرم رہتی۔ اس مجلس میں ہر قسم کی باتیں ہوتی تھیں۔ علمی مذاکرے ہوتے تھے۔ دینی مسائل پر گفتگو ہوتی اور تفریحی قصے بھی ہوتے۔ جس دن محرم ۱۳۰۱ھ کا چاند ہوا ہے اس دن حسب معمول ہم سب بعد مغرب اعلیٰ حضرت کی نشست گاہ میں آگئے۔

اعلیٰ حضرت خلاف معمول کسی قدر دیر سے پہنچے۔ حسب معمول سلام علیک کے بعد تشریف رکھی۔ اور لوگ بھی تھے، مجھے مخاطب کر کے فرمایا: کہ ننھن بھائی جان آج محرم ۱۳۰۱ھ کا چاند ہو گیا، میں نے عرض کیا کہ میں نے بھی دیکھا، بعض اور ساتھیوں نے چاند دیکھنا بیان کیا۔ اس پر فرمایا کہ بھائی صاحب یہ تو صدی بدل گئی۔ میں نے بھی عرض کیا: صدی تو بے شک بدل گئی۔ خیال کیا تو واقعی اس چاند سے چودھویں صدی شروع ہوئی تھی، اس پر فرمایا کہ اب ہم آپ کو بھی بدل جانا چاہیے۔ یہ فرمانا تھا کہ ساری مجلس پر ایک سکوت کا عالم طاری ہو گیا، اور ہر شخص اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا، پھر کسی کو بولنے کی ہمت ہی نہ ہوئی، بات سمجھ ہی میں نہ آئی کہ یکا یک اس رعب چھا جانے کا سبب کیا ہوا، دوسرے روز بعد نماز فجر جب سامنا ہوا اور ان کے مجددانہ رعب وجلال سے واسطہ پڑا تو یاد آیا کہ انھوں نے جو بدلنے کو فرمایا تھا تو وہ خدا کی قسم ایسے بدلے کہ کہیں سے کہیں پہنچ گئے اور ہم جہاں تھے وہیں رہے۔ وہ دن ہے اور آج کا دن کہ ہمیں ان سے بات کرنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ بلکہ اس اہم تبدیلی پر ہم نے تنہائی میں بارہا غور بھی کیا تو بہ جز اس کے کوئی بات سمجھ ہی میں نہ آئی کہ ان میں منجانب اللہ اس دن سے کوئی بڑی تبدیلی کر دی گئی ہے جس نے انھیں بہت اونچا کر دیا ہے، اور ہم جس سطح پر پہلے تھے وہیں اب ہیں۔ ہاں جب دنیا انھیں مجدد المأۃ الحاضرہ کے نام سے پکارنے لگی تو سمجھ میں آیا کہ وہ تبدیلی یہ تھی جس نے ہمیں اتنے روز حیران ہی رکھا۔ یہ تھی وہ تاریخ جس میں انھیں موجودہ صدی کا مجدد بنایا گیا، اور مجددیت کا منصب جلیل عطا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رعب عطا ہوا جو اسی تاریخ سے محسوس ہونے لگا۔ باوجود کہ ہمیں بے تکلفی کے لیل ونہار اب تک یاد ہیں، مگر رعب حق برابر روز افزوں ہے جو ان کے مدارج کی مزید ترقی کی دلیل ہے۔ (۱)

آپ کی تصانیف میں یہ پندرھویں تصنیف ہے جیسا کہ اس کتاب میں آپ نے خود ہی

---

(۱) سیرت اعلیٰ حضرت: ۶۰ تا ۶۲، طبع جدید امام احمد رضا اکیڈمی

ذکر فرمایا۔اس سے پہلے آپ تفضیلیہ کے رد میں مندرجہ ذیل سات کتابیں تصنیف فرما چکے تھے:

(۱)منتهى التفضيل لمبحث التفضيل .(۲)مطلع القمرين في ابانة سبقة العمرين (۱۲۹۷).(۳)معتبر الطالب في شيون أبي طالب(۱۲۹۴)(۴)الكلام البهي في تشبه الصديق بالنبي (۱۲۹۷)(۵)وجد الشوق بحلوة أسماء الصديق والفاروق(۱۲۹۷)(۶)اعتقاد الأحباب في الجميل والمصطفىٰ والآل والأصحاب(۱۲۹۸)(۷)البشر العاجلة من تحف آجلة(۱۳۰۰)

اول الذکر دونوں کتابوں کا ذکر زیر نظر کتاب میں متعدد مقامات پر آیا ہے۔

ان میں پہلی کتاب تو اپنی ضخامت کے لحاظ سے باب رضویات میں سب پر فائق ہے،اس لیے کہ آپ نے اس کو نوے(۹۰)اجزا پر رقم فرمایا تھا،اگر ایک جز ۱۶رصفحات ہی کا مانا جائے تو ۱۴۴۰رصفحات ہوئے جو آج تحقیق وترتیب جدید کی شکل میں تین سے چار ہزار صفحات ہوتے،آپ کی اس تصنیف کا نام تاریخی نہیں،ایک اندازے کے مطابق ۱۲۹۵ھ یا ۱۲۹۶ھ میں آپ نے یہ کتاب لکھی جب آپ کی عمر ۲۳،۲۴ رسال تھی۔اگر چہ یہ کتاب طبع نہ ہوسکی اور امتداد زمانہ کی دبیز تہوں میں دب کر منتظر طباعت ہے۔یا پھر بہت سی دیگر تصانیفِ رضا کی طرح ضائع ہوگئی۔تلاش بسیار کے بعد بھی راقم کو اب تک اس کا سراغ نہ لگا۔

پیش نظر کتاب "الزلال الانقیٰ" کا موضوع سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت کا اثبات ہے جس کے لیے آپ نے آیت کریمہ:﴿وسيجنبها الاتقیٰ﴾ میں وارد(الاتقیٰ) سے استدلال فرمایا ہے،کہ اس سے مراد باتفاق مفسرین آپ ہی کی ذات ہے۔

خطبہ کے بعد کتاب کی خوبیاں،احوال وکوائف،اپنے آبائے کرام ذوی الاحترام کا تذکرہ اور نثر ونظم دونوں میں ان کی مدح وثنا ہے۔پھر سبب تصنیف بیان فرماتے ہوئے ان واقعات کی طرف بھی اشارہ ہے جن میں سے بعض کا ذکر ہوا۔کیوں کہ وہ بھی اسی سنہ میں رونما ہوئے تھے۔

کتاب میں خطاب تفضیلی گروہ کے سرغنہ: صاحبان علم ودانش،مدعیان فضل وکمال اور ارباب فکر وفن سے ہے،لہذا آپ نے مضامین عالیہ کو کمال تحقیق وتدقیق سے بیان فرماتے ہوئے زبان بھی نہایت معیاری اختیار فرمائی ہے،اس لیے کہ کتاب عربی زبان کے محاورات،ضرب الامثال،استعارات وکنایات،محسنات بدیعہ اور زبان وادب کی بے شمار خوبیوں سے مزین ہے۔کتاب کے مضامین میں ذکر کردہ دلائل قرآن وحدیث کی روشنی میں تو ہیں ہی ساتھ ہی اصول

حدیث واصول تفسیر، فقہ واصول، نحو وبلاغت اور حکمت ومنطق کے بہت سے قواعد بھی نہایت تحقیق سے بیان فرما کر اپنے مدعا کو ثابت فرمایا ہے۔

مقدمہ اولیٰ: کتاب کا آغاز اُس آیت کریمہ سے ہوتا ہے جس میں اس چیز کا بیان ہے کہ اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اس کے بندوں میں سے وہی سب سے زیادہ عزت والا ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ آیت کریمہ کے شان نزول میں اس بات کی وضاحت ہے کہ اہل جاہلیت اپنے نسب پر نازاں رہتے تھے جس کو رد کر دیا گیا اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرما کر ان کے اس فخر کو خاکستر کر دیا۔ لہٰذا اب نہ کسی گورے کو کالے پر فضیلت ہے اور نہ عربی کو عجمی پر۔ غرض کہ نسب پر فخر کے رد وابطال کے سلسلہ میں معالم التنزیل، مدارک التنزیل اور کشاف کے حوالوں سے اس مطلب کو خوب خوب واضح کیا ہے۔

مقدمہ ثانیہ: اس مقدمہ میں اس آیت کا بیان ہے جس میں "اتقی" (سب سے بڑے پرہیزگار) کا ذکر ہوا ہے (کہ اس کو دوزخ سے بہت دور رکھا جائے گا) پھر اس کی وضاحت یوں فرمائی کہ اہل سنت وجماعت کے مفسرین کا اس بات پر اجماع ہے کہ "اتقی" سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ اس سلسلہ میں آپ نے ابن ابی حاتم، طبرانی، بغوی، ابوالسعود کی روایات کو عبد اللہ بن مسعود، عروہ بن زبیر، محمد بن اسحاق، ہشام بن عروہ، سعید بن مسیّب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن زبیر، وغیرہم راویان حدیث سے بیان کیا کہ حضرت صدیق اکبر نے یکے بعد دیگرے سات غلاموں کو خرید کر آزاد فرمایا تو یہ آیات نازل ہوئیں کہ: اور اس سے بہت دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو، اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے، جو سب سے بلند ہے اور بے شک قریب ہے کہ وہ راضی ہو (۱)

آخر میں فرمایا کہ امام بغوی، امام رازی اور علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ اس پر ہمارے اہل سنت مفسرین کا اجماع ہے کہ یہ آیات صدیق اکبر کے حق میں نازل ہوئیں، حتی کہ طبرسی رافضی نے بھی اپنی تفسیر "مجمع البیان" میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ والفضل ما شھدت به الأعداء۔

---

(۱) سورۃ اللیل: آیات: ۱۷، ۱۸، ۱۹

پھر فرماتے ہیں کہ یہاں مخالفین کی طرف سے چار وجوہ سے اعتراض ہوسکتا ہے جن کو ہم دو وجہ میں منحصر کر کے بیان کرتے ہیں:

وجہ اول: یہ تسلیم نہیں کہ صدیق اکبر پر کسی کا ایسا دنیوی احسان نہیں تھا جس کا بدلہ نہ ہو سکے، سب سے پہلے تو ان کے والدین ہی کا ان پر احسان تھا کہ انسان کبھی بھی ماں باپ کے احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتا، اور یہ احسان دنیوی ہے۔ اسی طرح حضور کے احسانات امت کے ہر فرد بلکہ جمیع خلائق پر ہیں کہ تمام نعمتوں کے خزانے اللہ تعالیٰ نے ان کے دست کرم میں دے دیے اور خلافت عظمیٰ اور نیابت کبریٰ کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ پھر کون ہے جو ان کا مرہون منت نہیں۔ لہذا اگر حضرت علی اس آیت کے مصداق نہیں تو حضرت ابو بکر بھی نہیں۔

اس وجہ کا جواب دو طرح سے دیا۔

جواب اول: آپ کی بات تسلیم کر لی جائے تو پھر آیت سرے سے معطل ہو جائے گی، اور کبھی کوئی اس کا مصداق نہ ہو سکے گا۔

جواب دوم: یہاں وہ دنیوی احسان مراد ہے جو انسان کی قدرت میں ہو۔

وجہ دوم: یہ بات تسلیم نہیں کہ صدیق و علی کی افضلیت پر اجماع مسلمین ہے، بلکہ یہاں دو فرقے اور ہیں۔ ایک حضرت عمر فاروق کی افضلیت کا قائل اور دوسرا حضرت عباس عم رسول کو افضل مانتا ہے۔ لہذا یہ کہنا درست نہیں کہ حضرت علی اس آیت کا مصداق نہیں تو صدیق اکبر متعین ہو گئے۔ خلاصہ یہ کہ یہاں یہ بھی ثابت کرنا لازم ہے کہ فاروق اعظم اور عباس عم مکرم کیوں اس آیت کا مصداق نہیں ہو سکتے۔

جواب: آیت کے نزول کے وقت یہ دونوں حضرات مسلمان ہی نہیں ہوئے تھے جیسا کہ آیت کا شان نزول ذکر کیا جا چکا۔

ان تمام تر تحقیقات کے باوجود تفضیلی گروہ کی جانب سے تین شبہات پیش کیے جاتے ہیں، لہذا آپ نے کتاب کو تین ابواب پر مرتب کیا اور ہر باب میں ایک شبہ کا جواب دیا۔

باب اول

یہاں شبہہ یہ ہے کہ آیت میں وارد لفظ (الاتقی) کے بارے میں بعض مفسرین نے کہا

ہے کہ یہ ''تقی'' کے معنی میں ہے، لہذا آپ کا استدلال ہی سرے سے ساقط ہوگیا۔

اس شبہہ کے جواب کے لیے سیدنا اعلیٰ حضرت نے پہلے پانچ مقدمات تحریر فرمائے ہیں، پھر خلاصہ کلام ہے اور آخر میں شبہہ کا دو طرح سے جواب ہے۔

مقدمہ اولیٰ: نقلی وعقلی دلائل سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بغیر حاجت الفاظ کو ان کے ظاہری معنی سے پھیرنا منع ہے۔

مقدمہ ثانیہ: کچھ تفاسیر میں نقل ہو جانا اس بات کو لازم نہیں کرتا کہ ہم اس کو تسلیم بھی کرلیں، کیوں کہ تفسیر مرفوع نہایت قلیل، اور اللہ تعالیٰ کی مراد کا قطعی علم بغیر اس کے دشوار۔

امام زرکشی نے تفسیر قرآن معلوم کرنے کے چار طریقے بتائے:

پہلا طریقہ: وہ تفسیر جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہو۔

یہ طریقہ سب سے ارفع واعلیٰ ہے، مگر دشواری یہ ہے کہ منقول روایات میں بہت سی ضعیف وموضوع ہیں۔ یہی حال صحابہ وتابعین کے اقوال کا ہے کہ تفسیر کے سلسلہ میں ان سے قلیل روایات ہیں اور ان میں بھی بہت کچھ غیر معتبر، ضعیف اور موضوع ہیں۔ پھر ان کے بعد ہر لغوی، نحوی، بیانی اور علوم قرآن کی کسی بھی نوع کا جاننے والا تفسیر میں مشغول ہو گیا اور جہاں تک اس کے فہم وفراست نے ساتھ دیا اس میں حصہ لیا۔ پھر ایسا زمانہ بھی آیا کہ لوگ ہر طرح کے اقوال جمع کرنے میں لگ گئے اور جو ملا سب نقل کر ڈالا۔ اس طرح حق وناحق کی ملاوٹ رونما ہوئی۔

ایسا اس لیے بھی ہوا کہ لوگوں نے کلام باری کی عظمت شان کا لحاظ نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی روزمرہ کی بول چال پر محمول کر کے محض الفاظ کو پیش نظر رکھا۔ لہذا ایسے لوگ غلطی پر غلطی کرتے گئے۔

امام سیوطی نے قدما کی تفسیروں کے بیان کے بعد فرمایا کہ: پھر تفسیر کی کتابوں کی اس طرح کثرت ہوئی کہ لوگوں نے اپنے خیالات کو بھی ان میں شامل کر دیا، اور بعد کے لوگوں نے یہ سمجھ کر نقل کر دیا کہ ان کی بھی کوئی اصل ہوگی۔

لہذا امام سیوطی نے آخر کتاب میں تمام کتب تفاسیر سے بے زاری کا اظہار فرماتے ہوئے تفسیر ابن جریر کی رہنمائی پر اکتفا کیا۔ اسی طرح امام ذہبی سیرت وتاریخ کی کتابوں سے عاجز آئے تو امام بیہقی کی دلائل النبوۃ پر اطمینان کا اظہار فرمایا۔

آخر میں فرماتے ہیں:

ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ تفسیر کی اکثر کتب غیر مستند روایات پر مشتمل ہیں۔لہذا ان اقوال کا تسلیم کرنا ہم پر لازم نہیں۔ اگر ہمارے سامنے اس طرح کے اقوال آئیں جن کے ذریعہ ظاہری معنی سے عدول ہو اور حاجت وضرورت متحقق ہونے کے ساتھ اس قول کی نسبت ایسی ذات کی طرف ثابت ہو جن کا قول واجب القبول مانا جاتا ہے جب تو ہم تسلیم کریں گے ورنہ نہیں۔

مقدمہ ثالثہ:

مفسرین جب کسی آیت کے مختلف معانی بیان کریں،تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف محض تعبیر کا ہوتا ہے حقیقی اختلاف نہیں۔وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن کے الفاظ متعدد معانی رکھتے ہیں،اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں،اور اس کی آخری منزل تک رسائی ممکن نہیں۔اور قرآن اپنے ہر معنی پر حجت ہے،اس سلسلہ میں چند احادیث بیان فرما کر لکھتے ہیں:

اب بحمد اللہ ثابت ہوگیا کہ ایسی جگہ قرآن کے ایک معنی دوسرے معنی کے منافی نہیں،اور کوئی ایک معنی دوسرے معنی کو چھوڑ دینے کو لازم نہیں کرتے۔اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ مجتہدین عظام ایک معنی سے استدلال کرتے ہیں حالانکہ ان کو علم ہوتا ہے کہ دوسرے معنی بھی ہیں۔پھر بسا اوقات مفسرین کا اختلاف نوعی ہوتا ہے نہ کہ اختلاف تضاد۔اس کی دو صورتیں ہیں:

اول صورت یہ ہے کہ معنی سب کے ایک ہوں۔جیسے ﴿الصراط المستقیم﴾ میں اختلاف ہوا۔

کوئی کہتا ہے کہ اس سے مراد قرآن ہے۔

کوئی اسلام،سنت وجماعت،طریقہ عبودیت وغیرہ بتاتا ہے۔

اور در حقیقت سب کا مرجع ایک ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مفسر کسی اسم عام کی ایک نوع بیان کرے،تو یہ حد تام کے طور پر نہیں ہوتا،جیسے قرآن میں وارد الفاظ ''ظالم. مقتصد. سابق'' کے بارے میں منقول ہوا کہ..

واجبات کا تارک اور محرمات کا مرتکب ''ظالم'' ہے۔

واجبات کی تعمیل اور محرمات کو ترک کرنے والا ''مقتصد'' ہے۔

اور واجبات کے ساتھ دیگر حسنات پر عمل کرنے والا ''سابق'' ہے۔

پھر بعض دیگر مفسرین عبادات میں اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ...

جو اول وقت میں نماز پڑھے وہ ''سابق''۔ درمیان وقت میں ''مقتصد''۔ اور مکروہ وقت میں پڑھنے والا ''ظالم'' ہے۔

پھر امام زرکشی کے حوالے سے فرمایا: بسا اوقات مفسرین کی مختلف عبارتوں سے کوتاہ فہم اختلاف حقیقی سمجھ بیٹھتے ہیں، حالانکہ مفسر کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ جو اس کے نزدیک زیادہ ظاہر ہو وہ معنی بیان کرتا ہے۔ یا پھر سائل کے حالات کو پیش نظر رکھ کر معنی بیان کرتا ہے۔ دوسرا مفسر اسی کے لازم معنی یا اس کی نظیر بیان کرتا ہے۔ اور کوئی مفسر ثمرہ ونتیجہ بیان کرتا ہے۔ اور ان سب کا مرجع ومآل ایک ہوتا ہے۔

پھر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرآنی آیات کے سیاق وسباق کو دیکھتے ہوئے جس معنی کا احتمال مفسر کو نظر آتا ہے اس کو بیان کر دیتا ہے۔ جیسے آیت کریمہ: ﴿انفروا خفافاً وثقالاً﴾ یعنی کوچ کرو ہلکے یا بوجھل۔ اب اس ''خفاف وثقال'' کی تفسیر میں کوئی جوان اور بوڑھا مراد لیتا ہے۔ کوئی غنی وفقیر۔ کوئی شادی شدہ اور کنوارا۔ کوئی صحت مند وبیمار۔ بیان کرتا ہے۔ اور آیت میں ان سب کا احتمال ہے۔

آخر میں فرمایا: یہ فصل وسیع وعریض ہے، اگر تفصیل بیان کریں تو مقصود کتاب ہی فوت ہو جائے گا۔

مقدمہ رابعہ:

یہ تاویل جس کا ضعف ظاہر کرنے کے لیے یہ طویل گفتگو کی، یعنی ''اتقی'' کو ''تقی'' کے معنی میں لینا، یہ ابو عبیدہ سے مروی ہے، مدارک میں اس کی صراحت ہے۔ اور ابو عبیدہ کا حال یہ ہے کہ یہ خارجی، زبان دراز اور علما کا بدگو تھا۔ اس کا نام معمر بن مثنیٰ تھا۔

اس کے ایک شاگرد ابو عبید تھے، کنیت میں تقریباً یکسانیت تھی، ان کا نام قاسم بن سلّام تھا۔ حدیث وفقہ میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور عالم ربانی تھے۔

استاذ وشاگرد کے درمیان امتیاز نہ رکھنے والے لوگ غالباً عدم امتیاز کے باعث اس بلا میں پڑے اور بلا جھجک استاذ کی روایات بھی تفسیروں میں نقل کردیں۔

مقدمہ خامسہ:

تفضیلی گروہ اس بات پر خوش ہے کہ بعض مفسرین نے ''اتقی'' کو ''تقی'' کے معنی پر اس لیے محمول کیا کہ صدیق اکبر کی صحابہ کرام پر افضلیت نہ ثابت ہو۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں۔ ابوعبیدہ جو اس ظاہری معنی سے پھیرنے والا ہے وہ خود بیان کرتا ہے کہ جس طرح یہاں ہے اسی طرح ''اشقی'' بھی بمعنی ''شقی'' ہے۔ لہذا ''اتقی'' سے مراد مومن اور ''اشقی'' سے مراد کافر۔ وجہ اس کی یہ بیان کرتا ہے کہ آگ میں جانا فقط بڑے شقی کے ساتھ خاص نہیں، اسی طرح نجات پانا بڑے متقی کا خاصہ نہیں۔

مطلب یہ ہوا کہ ''اتقی'' کو ظاہری معنی سے پھیرنا ابوعبیدہ کے نزدیک اس کے اپنے خیال میں ایک ضرورت تھی۔ اور وہ یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ''اشقی'' بھی اپنے ظاہری معنی پر رہے گا، اور جہنم میں محض ''اشقی'' سب سے بڑا شقی ہی جائے گا، جب کہ یہ تمام اشقیا کے لیے ہے۔

خلاصہ کلام

''اشقی'' کے بارے میں ظاہری معنی کا لحاظ کیا جائے (تو وہ خرابی جو ابوعبیدہ نے بیان کی) اس کے پیش نظر بہت سے مفسرین نے بھی فقط ''اشقی'' کے سلسلہ میں یہ توجیہ بیان کی ہے، اور اس کے ظاہری معنی سے پھیرا ہے۔

لہذا واحدی، رازی، قاضی، محلی، اور ابوسعود وغیرہم نے بیان کیا کہ...

''اشقی'' سے کوئی خاص شخص مراد نہیں۔ بلکہ مراد یہ ہے جو شقاوت میں حد کو پہنچا ہوا ہو۔ اور یہ حال تمام کفار کا ہے اس کے برخلاف مومن۔ تو اس میں ایک پہلو شقاوت کا بھی ہے اگر فاجر ہو، مگر یہ شقاوت فانی اور زائل ہو جانے والی ہے۔ یہاں لزوم نہیں جو ''یصلی'' سے سمجھا جارہا ہے۔

اس کے بعد قاضی ابوبکر باقلانی کی توجیہ بیان فرمائی:

وہ یہ ہے کہ ''اشقی'' بھی یہاں اپنے حقیقی معنی پر ہے، اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

وجہ اول یہ ہے کہ ﴿ناراً تلظّٰی﴾ سے دوزخ کی کوئی خاص آگ مراد ہو، کیوں کہ دوزخ کے مختلف طبقے ہیں۔

وجہ ثانی یہ ہے کہ اگر چہ اس سے تمام دوزخیں مراد ہیں مگر ''اشقیٰ'' دوزخ کا زیادہ مستحق ہے۔ گویا دوزخ اسی کے لیے بنی ہے۔

پھر فرمایا کہ امام نسفی نے بھی زمخشری سے اسی کے قریب قریب توجیہ نقل فرمائی:

وہ یہ کہ آیت مومنین ومشرکین کے دو بڑے شخصوں کی دو حالتوں میں موازنہ کے طور پر وارد ہوئی، اور ان کی دو متضاد صفتوں میں مبالغہ مقصود ہے۔ لہذا ایک بد بخت اور ہٹ دھرم کافر کے لیے ''اشقیٰ'' فرمایا اور جہنم کی آگ میں جانے کے لیے اسے خاص کیا، گویا جہنم کی آگ اسی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ اور ایک خوش نصیب مومن کامل کے لیے ''اتقیٰ'' فرمایا اور نجات اس کے لیے خاص فرمائی، گویا جنت انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔

یہ توجیہ نقل فرمانے کے بعد امام احمد رضا قدس سرہ لکھتے ہیں:

اقول: یہی وہ حصر ادعائی ہے جس کا بیان ہم نے تم سے کیا۔ بلاشبہہ یہ طریقہ فصحا کے درمیان دائر وسائر ہے۔

یہاں اولاً قاضی باقلانی کی وجہ اول پر بحث کے گوشوں کو اجاگر کیا اور پھر جواب بھی دیا ہے۔

ایک بحث یہ ہے کہ امام رازی اس بات پر راضی نہیں، وہ لکھتے ہیں کہ (ناراً تلظّٰی) دوزخ کی کسی خاص آگ کی صفت نہیں، بلکہ یہ تو دوزخ کی ہر آگ کی صفت ہے۔ لہذا دوسری آیت میں فرمایا: ﴿وانہا لظٰی، نزاعۃ للشوی﴾

اس پر فرماتے ہیں:

اقول: اس عبارت سے اعتراض کی دو جہتیں نظر آتی ہیں:

پہلی جہت یہ ہے کہ گویا معترض نے یہ گمان کرلیا کہ قاضی صاحب نار کے لیے لپٹ مارنے کی صفت سے مخصوص ہونے کے مدعی ہیں۔ مگر ایسا نہیں، بلکہ انھوں نے ''ناراً'' کی تنکیر سے تعظیم کا استفادہ کرتے ہوئے یہ معنی بیان کیے ہیں۔

اعلیٰ حضرت نے تنکیر برائے تعظیم کی وضاحت میں قرآنی آیات سے ثبوت دیا ہے۔

دوسری جہت یہ ہے کہ معترض شاید یہ بتانا چاہتا ہے کہ ﴿تلظّی﴾ یعنی لپٹ مارنا، بھڑکنا، یہ تو ہر آگ کی صفت ہے۔

فرماتے ہیں: اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں، کیوں کہ کسی جنس کے عظیم فرد کی ایسی صفت بیان کرنا جو تمام افراد میں پائی جاتی ہو ممتنع نہیں۔ البتہ اس کا عکس ضرور ممتنع ہے۔ دیکھو آیت کریمہ: ﴿وما محمد إلا رسول﴾ میں وصف رسالت سے حضور کی عظمت شان کو بیان فرمایا، حالانکہ اس وصف میں تمام رسول شریک ہیں۔

دوسری بات یہاں یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ ﴿تلظّی﴾ یعنی ''بھڑکنا'' کلی مشکک ہے، لہذا کوئی خاص ﴿تلظّی﴾ مراد لینا بھی جائز ہوگا۔ پھر اس کو بھی چند آیات کے ذریعہ واضح فرمایا۔ اور امام رازی نے اسی معنی کو اختیار کرنے کی نشان دہی بھی فرمائی کہ وہ خود ﴿نارٌ حامیہ﴾ میں تنوین کو تعظیم کے لیے قرار دیتے ہیں۔ اور پھر پر لطف مثل بیان فرمائی کہ: ''فما للشعیر یؤکل ویذم'' (یہ کیا بات ہوئی کہ جَو کھایا بھی جائے اور مذموم بھی قرار دیا جائے)

اس کے بعد قاضی صاحب کی تائید اور امام رازی کی تردید میں خود ایک توجیہ یوں ارشاد فرمائی:

اقول: ''لظی'' مجرد۔ اور ''تلظّی'' مزید فیہ ہے۔ اور لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دال۔ ساتھ ہی مشدد ہے جس سے شدت کے معنی مفہوم ہو رہے ہیں، مزید یہ کہ ادعائے حصر کا باب کشادہ ہے۔

ان تمام اعتبارات پر قرآنی آیات سے شہادتیں موجود ہیں۔

امام قاضی باقلانی کی دوسری وجہ کے تعلق سے بیان فرماتے ہیں کہ: بات ''اشقی'' کے تعلق سے تھی، کیوں کہ اس میں توجیہ کی ضرورت تھی، مگر ابو عبیدہ نے شطرنج میں خچر کا اضافہ کردیا۔ یعنی بالکل بے بنیاد اور بے تکی بات کہہ ڈالی۔ پھر متاخرین اس کو نقل کرتے گئے۔ لیکن امام رازی اس کی خرابی جانتے تھے، لہذا انھوں ''اشقی'' کے سلسلہ میں تو ایک قول نقل کیا کہ یہ شقی کے معنی میں ہے۔ مگر ''اتقی'' کے بارے میں کسی قول کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ بلکہ صراحت

فرمادی کہ یہ آیت غیر اتقی کے حال پر کچھ بھی دلالت نہیں کرتی۔ ہاں مفہوم مخالف سے کوئی استدلال کرے تو دوسری بات ہے۔

اس پر اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں:

یہ بات تو مفہوم صفت ماننے والوں کے مذہب پر بھی درست نہیں کہ مقام مدح وذم میں ان کے یہاں بھی اس کا اعتبار نہیں۔ پھر قاضی بیضاوی پر تعجب ہے کہ انھوں نے مفہوم صفت سے کیسے استدلال کرلیا کہ یہ تو بالاتفاق اس کا مقام نہیں، اور ان سے زیادہ تعجب امام باقلانی پر کہ انھوں نے حصر پر محمول فرمادیا، حالاں کہ وہ مفہوم میں اپنے ائمہ کے بالکل خلاف ہیں۔

اصل بات وہی ہے جو ہم نے شروع میں کہہ دی تھی کہ عصمت اللہ تعالیٰ کو اپنے اور اپنے حبیب کے کلام میں مقصود ہے اور بس۔

اس کے بعد ابو عبیدہ کا واضح انداز میں ردوابطال ہے، فرماتے ہیں: تم نے آیت ﴿ولا یصلٰها إلا الأشقى الذي كذب وتولىٰ﴾ میں موصوف "الاشقی" کو تو دیکھا مگر صفت ﴿كذب وتولىٰ﴾ کو نظر انداز کردیا۔

واضح رہے کہ کفار میں وہ بھی ہیں جنھوں نے زندگی بھر حضور کو نہ دل سے جھٹلایا اور نہ زبان سے۔ اس کا کفر تو یوں ہوا کہ نوشتۂ تقدیر غالب آیا اور توفیق ربانی نے ساتھ نہ دیا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔

یہ ہیں ابو طالب، جو محبت ونصرت اور حمایت میں آخری حد تک گئے اور اپنے بچوں پر بھی آپ کو ترجیح دی۔ اور ایک قصیدہ تقریباً سو اشعار پر مشتمل لکھا۔ (یہ سب کچھ تاریخ میں محفوظ ہے) پندرہ اشعار سیدنا اعلیٰ حضرت نے یہاں بھی نقل کیے اور پوری تفصیل بیان فرما کر تحریر فرمایا: جب بات یوں ہے تو حصر شقی مکذب میں درست نہیں۔

اس کے بعد ﴿الاتقى﴾ پر الف لام کے سلسلہ میں بات اٹھائی ہے اور فرمایا ہے کہ اگر عہد کے لیے نہ ہوا تو پھر استغراق کے لیے ہوگا۔ اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ بعض مومن جہنم کی آگ سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ تو اب استغراق بھی نہ رہا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: ٹھیک ہے آپ کی توجیہات کی بنا پر آپ کے حال پر چھوڑ

دیتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ کیا ''اتقی'' یہاں پر عام ہے؟ یہ آپ کی بڑی غفلت ہے کہ آپ نے اس کو عام سمجھا، یہاں تو اس کا ایک وصف خاص ﴿الذي يوتي ماله يتزكى﴾ بھی بیان ہو رہا ہے، اسی طرح ''اشقی'' کی صفت بھی آپ فراموش کر بیٹھے۔

لہذا سیدھی راہ یہی ہے کہ ''اتقی واشقی'' دونوں یا کم از کم ''اتقی'' کو ضرور اس کے ظاہری معنی پر رکھو۔

اس کے بعد مباحث جلیلہ بیان فرماتے ہوئے آخر میں فرمایا کہ:

اتقی کو تقی کے معنی میں لینے والوں کو چند طرح جواب دے سکتے ہو۔

وجہ اول: ظاہر لفظ کا تحفظ ضروری ہے۔

وجہ دوم: جس نے تاویل کی اس کو پاپڑ بیلنا پڑے اور فائدہ کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔

وجہ سوم: مان لیا کہ دونوں معنی درست، مگر ہم نے جو معنی بیان کیے وہی زیادہ واضح اور ظاہر ہیں۔ اور دونوں میں کوئی تنافی نہیں، تو جس سے تفضیل کا ثبوت ہو رہا ہے اس کا قبول کرنا ضروری ولازم۔ اس لیے کہ ہمارے علمائے کرام نے ہمیشہ اس آیت کو سیدنا صدیق اکبر کی افضلیت کے لیے پیش کیا۔ پھر ان سب کے مقابلہ میں ابوعبیدہ کے کلام کی کیا حقیقت۔

باب دوم

شبہہ ثانیہ:

اتقی بمعنی تقی ہے ورنہ صدیق اکبر کی فضیلت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر لازم آئے گی۔ یہ شبہہ استاذ استاذی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے اپنی تفسیر ''فتح العزیز'' میں نقل فرمایا۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ: اگر یہ اپنے عموم واطلاق پر رہا تو حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی شامل ہوگا، پھر تو سرکار پر بھی حضرت صدیق کی فضیلت لازم آئے گی۔

حضرت محدث دہلوی نے اس کا جواب یہ دیا کہ اسم تفضیل کو صفت مشبہ یا اسم فاعل کے معنی میں لینا عربی زبان کے خلاف ہے، لہذا درست نہیں۔ اور سرکار تخصیص عرفی کی بنا پر خاص کر لیے گئے ہیں، لہذا امراد نہیں۔

سیدنا اعلیٰ حضرت نے اس کو تسلیم نہ کر کے دو طرح سے جواب دیا:

اولاً: یہ کہ صیغہ اسم تفضیل صفت کے معنی میں خود قرآن میں وارد ہوا جیسے: ﴿هو الله الذي يبدؤ الخلق ثم يعيده وهو أهون عليه﴾ یہاں ﴿أهون﴾ بمعنی ''هيِّن'' ہے۔

اسی طرح اور آیات بھی ہیں۔ مگر یہ اسی وقت مانا جاتا ہے جب کوئی ضرورت داعی ہو۔

ثانیاً: اسی طرح شاہ صاحب نے جو تخصیص عرفی کی بات کہی اس سے تو یہ لازم آیا کہ مخالف کا دعویٰ تسلیم کرلیا۔ کیوں کہ تخصیص پہلے تعمیم کو چاہتی ہے۔ اور مخالف نے اسی کا سہارا لے کر ''اتقی'' کو تقی کے معنی میں لیا تھا۔

لہٰذا حق بات یہ ہے کہ نہ یہاں عموم ہے اور نہ تخصیص، بلکہ یہاں ایک نہایت لطیف بات ہے، تلخیص مقام یہ ہے کہ اسم تفضیل کا استعمال تین طرح ہوتا ہے، جب اضافت اور ''من'' کے ساتھ ہو تو مفضل علیہ صراحۃً مذکور ہوتا ہے۔ اور الف لام کے ذریعہ استعمال میں غیر مذکور مگر معہود اور متعین، اس لیے کہ مفضل کی تعیین بغیر مفضل علیہ ہوتی ہی نہیں۔ لہٰذا مفضل کی تعیین مفضل علیہ کی تعیین کو مستلزم۔ اور جب تعیین صراحۃً نہیں تو حکماً ہوگی۔

اب غور کرو کہ شریعت میں بعض امتیوں کی بعض پر تفضیل تو معہود و موجود ہے مگر بعض امت کی حضرات انبیا علیہم الصلاۃ والسلام پر تفضیل شریعت میں معہود نہیں، لہٰذا امتی کی تفضیل نبی پر نہ متکلم کا مقصود اور نہ سامع کو مفہوم ہوگی۔ اس لیے انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام ایسے مقام پر داخل ہی نہیں، تو پھر تخصیص کی کیا حاجت۔

بعض حضرات کی طرف سے دیگر جوابات بھی دیے گئے ہیں مگر ان سب کو اعلیٰ حضرت نے کوئی اہمیت نہیں دی۔

پھر احادیث اور دیگر دلائل سے صدیق اکبر کی افضلیت کو ثابت فرمایا ہے۔

باب سوم

شبہہ ثالثہ:

تفضیلی گروہ منطقی نہج پر صغریٰ و کبریٰ ترتیب دے کر اہل سنت کے استدلال کو باطل قرار دیتا ہے، شبہہ کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ:

﴿وسيجنبها الاتقى﴾ کا مفاد اہل سنت بتاتے ہیں کہ ''صدیق اتقی ہیں'' یہ صغریٰ

ہوا۔اور﴿إن أكرمكم عند اللّٰـه أتقكم﴾ کا مفاد ''ہر اکرم اتقی ہے'' یہ کبریٰ ہے، لہذا صدیق اکرم وافضل ہیں۔اب اگر اس کو شکل اول قرار دیں تو درست نہیں، کیوں کہ حد اوسط صغریٰ وکبریٰ دونوں میں محمول۔اگر شکل ثانی کہیں جب بھی غلط کہ کیف میں اختلاف نہیں۔

اور اگر کبریٰ کا عکس کر کے شکل اول بنانا چاہیں تو بھی صحیح نہیں، اس لیے کہ عکس موجبہ جزئیہ آئے گا۔اور شکل اول میں کبریٰ کا کلیہ ہونا لازم ہے۔اس لیے تفضیلیہ کا کہنا ہے کہ دونوں آیتوں کا مفاد نہ ہمیں مضر اور نہ تمہیں مفید۔

اعلیٰ حضرت نے فرمایا: یہ وہی شبہہ ہے جس کے بارے میں مجھے خبر پہنچی تھی کہ تفضیلی نے ہمارے کسی عالم کے سامنے اس کو پیش کیا ہے۔

فرماتے ہیں: اس اعتراض کی کوئی اہمیت نہیں، پھر بھی مخالفین کی طرف سے پیش ہوا ہے لہذا ہم اس کو بارہ طریقوں سے جواب دے سکتے ہیں۔ان میں سے ہر ایک شافی وکافی ہے۔

پہلی وجہ:

اگر معترض کو قرآن وحدیث اور علمائے کرام کے اقوال سمجھنے کی لیاقت ہوتی تو وہ الٹی بات نہ کہتا۔حقیقت یہ ہے کہ ''اکرم'' یہاں موضوع نہیں محمول ہے، اور ''اتقی'' موضوع۔یعنی ﴿إن أكرمكم عند الله أتقكم﴾ میں خبر مقدم اور مبتدا مؤخر ہے۔دلائل مندرجہ ذیل ہیں:

اول: زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا یہ گمان تھا کہ جو نسب میں بہتر وہی افضل۔اسلام نے اس کو رد فرمادیا اور یہ آیت: ﴿إن أكرمكم عند الله أتقكم﴾ نازل ہوئی۔لہذا اختلاف اس میں ہوا کہ افضل کون؟ اس میں نہیں کہ افضل کا معنی کیا ہے۔یہ ایسا ہی ہوا کہ سائل سب سے مزے دار کھانے کو پوچھے اور کوئی یوں جواب دے ''الحامض الذ'' اس کا تم رد کرتے ہوئے کہو: ''الذها احلاها'' یہاں بظاہر ترکیب نحوی میں ''الذ'' مبتدا، اور ''أحلی'' خبر ہے مگر مراد برعکس ہے یعنی ''الأحلی هو الألذ'' تو اب درحقیقت ''أحلی'' مبتدا ہوا اور ''الذ'' خبر۔

تو آیت میں ''اتقی'' ''احلیٰ'' کی طرح ہے کہ دونوں سے ذات مقصود ہے، جو محکوم علیہ ہے۔اور ''اکرم'' بمعنی افضل کا ''اتقی'' پر حکم ہے، جیسے: ''الذ'' کا ''احلی'' پر

مفسرین نے بھی آیت کا یہی مطلب سمجھا،لہذا زمخشری اورامام نسفی وغیرہما نے یہی بیان کیا۔

دوم: قرآن محسوسات کو بیان کرنے کے لیے نازل نہیں ہوا،اس کا نزول بندوں کو ان احکام سے باخبر کرنے کے لیے ہوا جن کو بندے ازخود نہیں جان سکتے،جیسے نجات وہلاکت،مردودومقبول،مغضوب ومرضی۔

لہذا پرہیز گاری وبدکاری کا علم تو حس سے ہوجاتا ہے،مگر اکرم وافضل ہونا رب کے بتائے بغیر نہیں معلوم ہوتا۔اب ''اکرم'' کوموضوع اورمحکوم علیہ بنانا گویا قلب موضوع ہے۔

اعلیٰ حضرت یہ بیان فرما کرارشادفرماتے ہیں:یہ وجہ فوری طور پر میرے ذہن میں آئی تھی،پھر میں نے اس کی تائید امام رازی کی تفسیر میں پائی۔مگر دونوں جوابوں میں جوفرق ہے کتاب کی تفصیلات میں ملاحظہ کریں۔

پھرسوال قائم کرکے جواب دیا کہ شاید تم تقویٰ کے بارے میں کہو کہ یہ تو صفت قلب ہے پھراس کوآپ نے محسوس کیسے کہہ دیا؟۔

جواب دیا:بے شک تقویٰ کا مقام قلب ہے،اور اسی سے ہم ثابت کرتے ہیں کہ صدیق اکبرسب سے بڑے متقی توسب سے بڑے عارف باللہ بھی ہیں۔لیکن واضح رہے کہ اس کے آثاراعضاپرظاہرہوتے ہیں۔تو یہ محسوسات سے بایں معنی ہے۔

سوم: آیت:﴿سیجنبها الاتقی.........﴾کا جوشان نزول بیان ہوااس کے مطابق آیت کے معنی اسی وقت درست ہوں گے جب کہ ''اتقی'' کو موضوع قرار دیں۔مثلاً:حضور نے سیاہ فام غلام کی عیادت کی اورنماز جنازہ ادافرمائی۔لوگوں نے اس غلام کو حقیر جانا تھا۔ارشادہوا:وہ ہمارے نزدیک کریم وبزرگ ہے کیوں کہ وہ متقی تھا۔

اور تفضیلی کے یہاں جومعنی گمان کیے گئے وہ اس طرح ہوں گے۔وہ بزرگ تھا،اور ہر بزرگ متقی،لہذا حضور نے اس کی عیادت کی۔

اس معنی میں جونقص اورخرابی ہے وہ ادنیٰ فہم والے پربھی روشن،کیوں کہ غلام کو بزرگی تو ان کے نزدیک حاصل ہی نہیں تھی،ورنہ اعتراض ہی نہ کرتے۔لہذا نزاع تقویٰ کے بارے میں

نہیں بلکہ بزرگی کے بارے میں تھا۔

چہارم: حضرت بلال کے بارے میں کفار کا استدلال یوں تھا:

صغریٰ: بلال غلام ہیں۔

کبریٰ: کوئی غلام عزت والا نہیں۔

نتیجہ: بلال عزت والے نہیں۔

آیت ان کے رد میں نازل ہوئی، تو رد اسی وقت ہوگا جب دونوں مقدموں میں سے کسی پر نقض وارد ہو۔ صغریٰ تو متفق علیہ ہے، لہذا کبریٰ پر نقض وارد کرنے کے لیے آیت کریمہ نازل ہوئی۔ اور بتایا گیا کہ کبریٰ کاذب ہے، اس لیے کہ اس کی نقیض ''بعض غلام با عزت ہیں'' ثابت ہے۔ اس نقیض کا اثبات ہمارے ہی طریقے پر ہوسکتا ہے، یعنی:

بعض غلام متقی ہیں۔

جو متقی ہے وہی اکرم ہے۔

لہذا بعض غلام اکرم ہیں۔

اور اے تفضیلیو! تمہارے طریقے پر یوں ہوگا:

بعض غلام متقی ہیں۔

ہر اکرم متقی ہے۔

دیکھو! یہ وہی قیاس ہے جس پر تمہارا اعتراض تھا کہ حد اوسط دونوں جگہ محمول ہے۔ تو نہ یہ شکل اول ہوسکتی ہے۔ اور نہ شکل ثانی، کہ کیف میں اختلاف نہیں۔

پنجم: حضرت ثابت بن قیس نے ''فلانی کے بیٹے'' کہہ کر تحقیر کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کو رد فرمایا، یعنی یہ کہنا باطل کہ ''کوئی بھی کم تر نسب کریم نہیں'' اس لیے کہ اگر یہ صادق تو شکل اول کی ترتیب پر ''بعض متقی کریم نہیں'' بھی صادق ہوگا۔ کیوں کہ اب ترتیب شکل یوں ہوگی ''بعض متقی نسب میں کم تر ہیں۔ کوئی کم تر نسب کریم نہیں'' نتیجہ نکلا: بعض متقی کریم نہیں۔ یہ تمہارے نزدیک صادق ہوگا حالانکہ یہ باطل ہے۔ اس لیے کہ اس کی نقیض ''ہر متقی کریم ہے'' صادق ہے۔

دراصل یہ قیاس استثنائی ہوا جس میں ایک قضیہ شرطیہ ذکر کر کے اس کے مقدم یا تالی

کا استثنا کیا جاتا ہے، اگر وہ شرطیہ متصلہ ہو تو نتیجہ وضع مقدم سے وضع تالی ہوگا، اور رفع تالی سے رفع مقدم۔ جیسے: لو كانت الشمس طالعة لكان النهار موجوداً، لكن الشمس طالعة، فالنهار موجود (یہ وضع مقدم سے وضع تالی ہے) یا کہا جائے: لكن النهار ليس بموجود، فالشمس ليست بطالعة (یہ رفع تالی سے رفع مقدم ہے)

درج بالا کلام میں قیاس استثنائی کی ترتیب یوں ہوئی: لو صدق "ليس أحد من دني النسب بكريم" لصدق قولنا "بعض المتقي ليس بكريم" (للقياس المطويّ المذكور) لكن التالي (أي بعض المتقى ليس بكريم) باطل لصدق نقيضه "كل متقٍّ كريم" فالمقدم (أي ليس أحد من دني النسب بكريم) مثله (أي باطل)۔

اگر تمہارے طریقہ پر کہا جائے تو مقدمہ استثنائیہ یہ ہوگا کہ "ہر کریم متقی ہے" اس سے لازم (بعض متقی شریف نہیں) رفع نہیں ہوتا تو ملزوم (کوئی کم تر نسب والا کریم نہیں) بھی رفع نہ ہوگا، اس لیے کہ "بعض المتقى ليس بكريم" کی نقیض "كل كريم متق" نہیں، تو اس سے تالی کا ابطال نہ ہو سکے گا اور مقدم اپنی جگہ رہ جائے گا۔

ششم: وہ احادیث جو آیت کی تفسیر میں آئیں، یا اس نہج پر وارد ہوئیں، یا اس کے شواہد و امثال کے طور پر مروی ہوئیں، وہ ہمارا مقصد ثابت کرتی ہیں، اور تمہارے مذہب کو باطل ٹھہراتی ہیں۔

یہاں اعلیٰ حضرت نے اپنی طویل اور مکمل سند سے متعدد روایات بیان کی ہیں، جیسے حضور سے پوچھا گیا: افضل کون ہے؟ فرمایا: افضل وہ جو اتقی ہے۔ دوسری روایت میں فتح مکہ کے دن خطبہ دیا، اس میں بیان فرمایا: آدمی دو طرح کے ہیں: ایک متقی اللہ تعالیٰ کے یہاں اکرم۔ دوسرا بدکار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ذلیل۔

دیکھو! حضور نے دو قسمیں بیان فرما کر ایک کو فضیلت اور دوسرے کو ذلت سے متصف قرار دیا۔ تیسری حدیث میں حضور نے دعا کی اے اللہ! تقویٰ کے ذریعہ عزت عطا فرما۔ چوتھی حدیث میں: جو اللہ تعالیٰ کے یہاں عزت چاہے وہ اللہ سے ڈرے۔ یہ احادیث ہمارے دعوے یعنی "اتقی" کے موضوع ہونے پر روشن دلائل ہیں۔

ہفتم: یہ قضیہ کہ ''ہر کریم انسان، حیوان، اور جسم ہے'' کیا ان تینوں اوصاف کی بنیاد پر تم کہہ سکتے ہو کہ کریم میں کوئی دینی خوبی نکلی۔ اور اگر معترض یہ کہنے لگے کہ تقویٰ ایسا وصف ہے جو عزت وفضیلت والوں کے ساتھ خاص ہے، اور آپ کے ذکر کردہ اوصاف ایسے نہیں۔ تو ہم جواب میں کہیں گے: ہاں اب تم وہیں آ گئے جہاں سے راہ فرار اختیار کی تھی۔ لہذا اب ''ہر متقی کریم ہے'' کہنا درست ہوگا، یہی تو ہمارا مقصد تھا۔

ہشتم: ان احادیث کو دیکھو: حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

آدمی کی عزت اس کا دین ہے۔ اس کی مروت اس کی عقل ہے۔ اس کا حسب اس کا خلق ہے۔

نیز ارشاد فرمایا:

عزت، پرہیزگاری ہے۔ شرافت، خاکساری ہے۔ حیا زینت ہے۔ تقویٰ کرم ہے۔

ان احادیث میں غور کرو، مثلاً: حضور نے عقل ہی کو مروت سے موصوف قرار دیا۔ مروت کو عقل سے نہیں۔ اسی طرح آپ کا خلق پر حسب کا حکم لگانا۔ خاکساری پر شرافت کا۔ تقویٰ پر کرم کا۔

اس مقام پر ایک قاعدہ کلیہ بیان فرمایا: وہ یہ کہ کہیں دو اسم معرف باللام ہوں اور ان میں ایک دوسرے پر محمول ہو۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ دوسرا اسم بغیر الف لام پہلے کا محمول ہوسکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو وہ اس قضیہ میں بھی محمول ہوسکتا ہے ورنہ نہیں۔ راز یہ ہے کہ محمول کا نکرہ لانا ہمیشہ جائز۔ اور موضوع کو کبھی نکرۂ محضہ نہیں لایا جاتا۔ اسی لیے تو ''الکرم تقوی'' یا ''الکرم دین'' کہنا جائز نہیں۔ ہاں اس کے برعکس ''التقویٰ کرم. الدین کرم'' درست ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی نکتے کے پیش نظر جب ''تقویٰ'' کو مقدم فرمایا تو ''کرم'' کو نکرہ ذکر فرمایا، اور جب مؤخر فرمایا تو ''الکرم'' معرف باللام ارشاد فرمایا۔

نہم: اگر تم سے کوئی یہ کہے کہ سب سے عظیم وہ ہے جو سب سے بڑا متقی۔ پھر وہ جو تقویٰ میں اس سے کم۔ پھر وہ جو اس سے کم۔ إلیٰ آخرہ۔ تو یہ تم اور ہر کوئی اس کو تسلیم کرے گا۔

اس کے برخلاف اگر کوئی کہے: اکرم سب سے بڑا متقی ہے۔ پھر وہ جو تقویٰ میں کم

ہے۔ پھر وہ جو اس سے کم ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ ''اکرم'' تنہا کبھی بڑا متقی ہوتا ہے، اور یہی کبھی چھوٹا اور کبھی اس سے بھی چھوٹا ہوتا ہے، حالانکہ ایسا ہوگا تو پھر اکرم ہی کب رہے گا۔ تفضیلی کا یہ قول پاگل کی بڑ ہے کہ بولتا ہے اور سمجھتا نہیں۔

اگر تفضیلی کی بات مان لی جائے تو پھر احادیث کے معانی میں خلل اور خرابی لازم آئے گی۔ مثلاً: حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

سب سے پیاری چیز وہ نماز ہے جو وقت پر ادا کی جائے۔ پھر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔ پھر جہاد۔

اگر تفضیلی کے گمان کے مطابق ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ سب سے زیادہ محبوب کام پہلے نماز سے متصف ہوتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد حسن سلوک ہو جاتا ہے۔ پھر کچھ لمحے بعد جہاد ہو جاتا ہے۔ ایسی تعجب خیز بات تو کسی نے نہ سنی ہوگی۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ خبر کی تقدیم ایسے مقامات پر شائع وذائع ہے۔ بلکہ اکثر وبیشتر ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس موضوع پر سیکڑوں احادیث پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر طوالت کا خوف دامن گیر ہے۔ بعض ملاحظہ کیجیے:

ان میں پہلی حدیث بالکل اسی نہج پر دو مقدمے اپنے اندر لیے ہوئے ہے جن سے علمائے کرام نے ایک نتیجہ اخذ کیا جیسے ہم نے دونوں آیتوں سے۔ ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔ علامہ مناوی نے اس کا نتیجہ بیان کیا: تو میں مطلقاً تم سے بہتر ہوں۔

کیا تفضیلی اس قیاس اور ہمارے مرتب کردہ قیاس میں کوئی فرق نکال سکتا ہے:

(۲) اونٹوں پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے بہتر قریش کی نیک اور پارسا عورتیں ہیں۔

(۳) ساتھیوں میں سب سے بہتر اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے

بہتر ہو۔

(۴) پڑوسیوں میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔

(۵) سب سے بہتر ذکر پوشیدہ ذکر ہے۔

(۶) سب سے زیادہ فضیلت والا صدقہ وہ ہے جو پوشیدہ طور پر فقیر کو دیا جائے۔

(۷) بے شک قربانی کے جانوروں میں سب سے زیادہ فضیلت والا سب سے قیمتی اور سب سے فربہ ہے۔

(۸) بے شک سب سے زیادہ لوگوں کی تصدیق کرنے وہ ہے جس کی بات سب سے زیادہ سچی ہو۔

(۹) لوگوں کو سب سے زیادہ جھوٹا بتانے والا وہ ہے جو اپنی بات میں سب سے بڑا جھوٹا ہو۔

(۱۰) لوگوں میں سب سے زیادہ گناہوں والا قیامت کے دن وہ شخص ہوگا جس نے دنیا میں لایعنی باتیں کی ہوں گی۔

(۱۱) بے شک لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب قیامت کے دن وہ ہوگا جس نے مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھا ہوگا۔

ان سب احادیث میں مبتدا مؤخر اور خبر مقدم ہے۔

پھر ایک حدیث یوں بھی آئی ہے:

جو شخص امتیوں میں مجھ پر سب سے زیادہ درود پاک پڑھے گا وہ مجھ سے درجہ میں زیادہ قریب ہوگا۔ اس میں مبتدا مقدم اور خبر مؤخر ہے۔

معلوم ہوا کہ ایسے مقامات میں تقدیم وتاخیر کی کوئی پروانہیں کی جاتی۔ کہ یہاں التباس کا کوئی خطرہ نہیں۔ وجہ وہی ہے جو پہلے ذکر ہوئی کہ یہ احکام شرعیہ ہیں۔ اللہ ورسول کے بتائے بغیر معلوم نہیں ہوتے، لہذا یہی اس لائق ہیں کہ ان کو محمول قرار دیا جائے۔ نیز ذہن اسی طرف سبقت کرتا ہے خواہ آپ مقدم کریں یا مؤخر۔

اس مقام پر ہوسکتا ہے کہ کوئی کہے: نحویوں کا قاعدہ ہے کے جب مبتدا وخبر معرفہ ہوں۔ یا دونوں مساوی ہوں تو مبتدا کی تقدیم واجب ہے۔ تو واضح رہے کہ یہ قاعدہ اکثری ہے کلی نہیں۔ مزید یہ کہ التباس کا اندیشہ ہوتو یہ حکم ہوگا ورنہ نہیں۔ اور متون میں اس قاعدہ کا علی الاطلاق ہونا کوئی مضر نہیں، کہ آخر شروح وحواشی اسی لیے معرض تحریر میں آئے، اور اساتذہ کی ضرورت یوں ہی درپیش ہوئی۔ فقہ کی کتابیں ایسے علی الاطلاق مسائل سے لبریز ہیں۔ اب جس نے خطا کی اس نے کی۔ اور جو راہ راست پر گامزن ہوا مراد کو پہنچا۔

آخر میں بیان فرماتے ہیں کہ معترض اپنے اعتراض سے باز آیا، مگر اب یہ پوچھتا ہے کہ خبر کی تقدیم میں جو نکتہ ہے وہ تو بتایے۔ جواب میں فرماتے ہیں: اس مین انوکھے نکتے ہیں:

اول: خبر پوشیدہ اور مبتدا کا ادراک ظاہر وباہر ہو تو گویا خبر معرَّف ہے اور مبتدا تعریف، اور تعریف بلاشبہ موخر ہوتی ہے۔

دوم: قلب انجانی چیز کی طرف لپکتے ہیں، لہذا جب ان کے کانوں میں پوشیدہ چیز پڑے گی اور امید ہوگی کہ اب اس چیز کا بیان ہونے والا ہے جس سے اس کی پوشیدگی دور ہوجائے گی تو کان لگا کر متوجہ رہے گا، اور سنتے ہی بات دل میں جم جائے گی۔

سوم: شریعت میں مقصود اعمال کے ثمرات ونتائج ہیں، اور مقاصد کا یہ حق ہے کہ مقدم ہوں۔

دہم: وجہ دوم: یہ ان تین اصل الاصول وجوہ کی دوسری ہے جو بارہ طریقے بتائے تھے۔ لہذا اس کو وجہ دوم فرمایا۔

بالفرض ہم مان لیں کہ ''اکرم'' موضوع ہے ''اتقی'' محمول۔ پھر بھی تم غور کرو کہ یہ دونوں اسم تفضیل ہیں۔ لہذا دونوں کا مصداق ایک ہی ذات ہوگی۔ تعدد ممکن ہی نہیں، تو دونوں متحد۔ اب جس کو چاہو موضوع بناؤ اور جس کو چاہو محمول۔ ذات ایک ہی رہی۔ اس کی بے شمار نظیریں ہیں، یہاں آپ نے سترہ شمار کرائیں۔ جیسے:

سب نبیوں میں افضل وہ ہیں جو سب سے پہلے پیدا کیے گئے۔

سب رسولوں سے افضل وہ ہیں جو سب کے بعد مبعوث ہوئے۔

سب سے اونچا آسمان حجم میں سب سے بڑا ہے۔

سب سے خاص کلی سب سے کم افراد والی ہے۔

سب سے پہلے داخل ہونے والا سب سے بعد نکلنے والا ہے۔

واضح رہے کہ کسی قضیہ میں دو اسم تفضیل اپنے حقیقی معنی پر مشتمل مضاف ہوں اور دونوں کا مضاف الیہ ہو پھر ایک کو موضوع اور دوسرے کو محمول بنایا جائے۔ تو ان شرائط کی جامع کوئی ایسی مثال نہیں دکھائی جاسکتی جس میں عکس درست نہ ہو۔ لہذا مذکورہ بالا مثالوں میں موجبہ کلیہ کا عکس بہر حال موجبہ کلیہ ہی آئے گا۔ اور ہم زیر بحث مسئلہ میں قیاس مرتب کر کے اپنا مدعا حاصل کرلیں گے۔ یعنی۔

شکل اول: ابو بکر صدیق اتقی ہیں۔ ہر اتقی اکرم ہے۔

نتیجہ: ابو بکر صدیق اکرم ہیں۔

یہاں "ہر اتقی اکرم ہے" صادق ہے۔ اس لیے کہ اس کا عکس "ہر اکرم اتقی ہے" صادق ہوسکتا ہے۔ معترض اگر کہہ دے کہ موجبہ کا عکس جزئیہ آتا ہے، یہاں آپ نے کلیہ بیان کردیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ مناطقہ نے یہ اصول اس لیے بنایا تھا کہ کبھی محمول عام ہو تو کلیہ صادق نہ ہوسکے گا، لہذا جزئیہ قرار دیا۔ اور ہماری بحث میں محمول عام نہیں بلکہ مساوی ہے۔ نیز مناطقہ نے یہ کب کہا ہے کہ کلیہ نہیں آسکتا۔

آخر میں فلسفی کو تنبیہ کر رہے ہیں کہ اے فلسفی! اب تو تیری سمجھ میں آگیا ہوگا، لہذا اب تو اپنے وسوسوں کو روک اور مغالطوں سے باز آجا۔

وجہ سوم: تمام باتوں سے قطع نظر ہم نے مان لیا کہ آیت کا مفاد یہ ہے کہ "ہر اکرم اتقی ہے" اور اس کا عکس نقیض یوں ہے کہ "جو اتقی نہیں اکرم نہیں" مگر یہ یاد رہے کہ ہم نے تحقیق سے یہ بات ثابت کردی ہے کہ ﴿وسیجنبها الاتقی﴾ میں "اتقی" سے مراد وہ ہیں جو تمام صحابہ سے اتقی ہوں یعنی صدیق اکبر۔ اور یہ بھی ثابت کردیا کہ تقوی میں کوئی ان کے برابر نہیں۔ لہذا اب قیاس کی ترتیب یوں ہوگی۔

صغریٰ: كل صحابي فهو ليس بأتقى من أبي بكر

کبریٰ: ومن لیس باتقیٰ منہ لیس باکرم منہ

نتیجہ: کل صحابي فھو لیس باکرم من ابي بکر

یہاں دعویٰ ایک قیاس استثنائی سے بھی ثابت ہوسکتا ہے جس میں رفع تالی کے سبب رفع مقدم ہو۔ جیسے کہو:

صغریٰ: اگر امت میں کوئی صدیق اکبر سے اکرم ہوگا تو وہ ان سے اتقی بھی ہوگا۔

اس لیے کہ تم نے پہلے ہی طے کر رکھا ہے کہ "ہر اکرم اتقی ہے"۔

کبریٰ: لیکن امت میں کوئی بھی صدیق اکبر سے اتقی نہیں۔

آیت ثانیہ اس پر گواہ ہے۔

نتیجہ: امت میں کوئی بھی صدیق اکبر سے اکرم نہیں۔

ان تمام مباحث کے بعد تحدیث نعمت کے طور پر فرماتے ہیں:

میں امید کرتا ہوں کہ گزشتہ عبارات میں جو ایسے روشن معانی ہیں جن کی چمک اور روشنی گمراہی کے اندھیروں کو کافور کر رہی ہے، اور ان میں ایسے پرنور مفاہیم ہیں جو شکوک وشبہات کی گھٹاؤں میں اجالے کا سامان فراہم کر رہے ہیں ان میں اکثر میری ہی کاوش کا نتیجہ ہیں اور میں نے ہی اپنی خداداد صلاحیت سے ان کو پردۂ خفا سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر ثبت کیا۔

خاتمہ

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین، علیہ التحیة والتسلیم

یہاں سیدنا اعلیٰ حضرت کے فرمان کا خلاصہ کچھ اس طرح ہے کہ:

ان تمام مباحث جلیلہ کے بعد نتیجہ کیا نکلا؟ کیا ہم صدیق اکبر کی افضلیت کو قطعی مان لیں؟ اگر قطعی مانیں تو سوال یہ ہے کہ کیا اس میں کوئی دوسرا احتمال نہیں؟

جواب یہ ہے کہ تم قطعی مانو، اس لیے کہ جب دو مقدمے قطعی ہوں تو ان کا نتیجہ بھی قطعی ہوتا ہے۔ پہلا مقدمہ تو بایں معنی قطعی ہے کہ اتقی سے مراد صدیق اکبر ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے جو قطعی ہے۔ دوسرا مقدمہ اس طرح کہ آیت اولیٰ مدعا میں نص ہے جس میں کوئی شک

نہیں۔ اور احتمال بلا دلیل قطعی کو قطعیت سے خارج نہیں کرتا۔ نیز یہاں یہ بھی واضح رہے کہ علم قطعی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اول: احتمال بالکل ختم ہو جائے اور اس کا نام ونشان نہ رہے۔ یہ قطعی بالمعنی الاخص ہے۔ یہ اس محکم ومفسر میں ہوتا ہے جو متواتر ہیں۔ اصول دین اور عقائد اسلام میں یہی مطلوب ہے۔

دوم: احتمال تو ہے مگر بلا دلیل ہے۔ جیسے: مجاز، تخصیص، یا تاویل کی دوسری قسمیں جو ظاہر اور نص یا احادیث مشہورہ میں ہوتی ہیں۔ یہ قطعی بالمعنی الاعم ہے۔

اول کا نام علم الیقین ہے۔ اس کا منکر ومخالف کافر ہے۔

البتہ یہاں ایک اختلاف ہے، فقہا منکر کو علی الاطلاق کافر کہتے ہیں اور متکلمین اس میں ضروریات دین کی قید لگاتے ہیں۔

دوم کا نام علم طمانیت ہے، اس کا مخالف ومنکر بدعتی وگمراہ ہے۔

یہاں کافر کہنے کی گنجائش نہیں۔ جیسے: قیامت میں اعمال کا تولا جانا۔ دیدار الٰہی۔ آسمانوں کی بلندی تک معراج جسمانی۔

اسی طرح ظن کے دو معنی ہیں: ظن بالمعنی الاخص۔ ظن بالمعنی الاعم۔

(ظنی اسے کہتے ہیں جس میں کوئی احتمال ہو۔ اگر احتمال کسی دلیل کی بنیاد پر ہے تو یہ ظنی بالاخص ہے۔ اور بلا دلیل ہے تو ظنی بالاعم۔ اسی کو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ عام کا مقابل خاص اور خاص کا مقابل عام ہوتا ہے)

اس کے بعد وضاحت فرمائی کہ مسئلہ تفضیل قطعی بالمعنی الاعم ہے، اور ہم اس کے منکر کو کافر نہیں کہتے، البتہ بدعتی وگم راہ ہیں۔ اور جس نے یہ کہا کہ مسئلہ تفضیل میں نصوص متعارض ہیں لہذا استدلال ساقط۔ تو ایسا قول ساقط الاعتبار ہے اگر اس کی مراد تعارض حقیقی ہے۔ رہا تعارض صوری تو مسئلہ پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

اب بات واضح ہو گئی کہ ہمارے ائمہ کرام میں بعض نے جو مسئلہ تفضیل کو قطعی کہا ہے اور ظنی کی نفی کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قطعی بالمعنی الاعم ہے جس سے علم طمانیت حاصل ہوتا

ہے۔اور ظنی کی نفی سے ظنی بالمعنی الاخص کی نفی ہے۔یعنی اس میں کوئی احتمال بالدلیل نہیں۔
اور جنھوں نے ظنی کہا اور قطعی کی نفی کی تو مطلب یہ ہے کہ قطعی بالمعنی الاخص نہیں جس میں سرے سے احتمال ہی نہیں ہوتا۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں۔اور ظنی سے مراد ظنی بالمعنی الاعم ہے،جس میں احتمال تو ہوتا ہے مگر بلا دلیل۔لہذا یہ اختلاف محض لفظی ہے۔
یہاں کسی کو یہ کھٹک ہوسکتی ہے کہ مسئلہ تو اعتقادی ہے پھر قطعی بالمعنی الاعم یعنی ظنی بالمعنی الاعم پر اعتماد کیوں کر روا ہوگا۔جواب یہ ہے کہ مسئلہ اصول اسلام سے نہیں۔جیسے خلفائے راشدین کی خلافت۔
اس کے بعد فرمایا کہ ہماری تحقیق کے ذریعہ بہت سے اقوال میں تطبیق ہوگئی،لہذا اس کو اختیار کرلو۔
واضح رہے کہ اس مسئلہ کو قطعی فرمانے والوں میں سرفہرست امیر المؤمنین مولی المسلمین حضرت علی مرتضی کرم اللہ وجھہ الکریم ہیں،آپ نے بر سر منبر فرمایا: میں نے کسی ایسے شخص کو پایا جو مجھے ابوبکر وعمر پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر مفتری کی حد جاری کروں گا۔حالاں کہ حد جاری کرنے کے سلسلہ میں خود ہی حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ حدود کو جہاں تک ہوٹالو،اور دفع کرو۔
اس سے مطلب واضح ہے کہ تفضیل کا قائل ان کے نزدیک قطعی طور پر حد کا مستحق تھا۔پھر یہ کہ حضرت علی کا مجمع صحابہ میں اعلان کرنا اور کسی کا اختلاف منقول نہ ہونا صاف صریح طور پر بتاتا ہے کہ اس پر صحابہ کا اجماع تھا۔
حضرت امام اعظم،امام مالک،امام شافعی،امام ابوالحسن اشعری،امام غزالی،علامہ ابن حجر عسقلانی،علامہ احمد بن محمد قسطلانی،علامہ زرقانی،علامہ علی قاری وغیرہم ائمہ اعلام وعلمائے دین نے تفضیل شیخین پر اجماع نقل فرمایا۔
ان تمام تفصیلات کے بعد سیدنا اعلیٰ حضرت نے سورۂ ''واللیل'' جس میں صدیق اکبر کے فضائل اور سورۂ ''والضحیٰ'' جس میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مناقب ذکر ہوئے ہیں،ان کے تعلق سے تین نکتے بیان فرمائے ہیں: پہلا نکتہ امام رازی سے منقول ہے۔دوسرا

اور تیسرا خود امام احمد رضا کا طبع زاد ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

پہلا نکتہ: امام رازی نے فرمایا: ان دونوں سورتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تاکہ اچھی طرح جان لیا جائے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان بھی کوئی واسطہ نہیں۔ لہذا جب تم پہلے ''واللیل'' کا ذکر کرو گے جس سے مراد صدیق اکبر ہیں پھر جب آگے بلندی پر جاؤ گے تو ''والضحیٰ'' دن کو پاؤ گے کہ اس مراد حضور اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ اور پہلے ''والضحیٰ'' کا ذکر کرو گے جس سے حضور مراد ہیں پھر جب نیچے آؤ گے تو ''واللیل'' کو پاؤ گے۔ یہ دونوں ترتیبیں اشارہ کر رہی ہیں کہ حضور اور صدیق اکبر کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔

دوسرا نکتہ: اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: سورۂ ''واللیل'' میں صدیق اکبر کی ذات اقدس پر کفار کی جانب سے طعن و تشنیع کا جواب ہے، اور ''والضحیٰ'' میں حضور کی ذات پر طعن کا جواب ہے۔ اور یہ واضح بات ہے کہ حضور کی براءت صدیق اکبر کی براءت کو مستلزم نہیں کہ حضور اعلیٰ ہیں۔ البتہ صدیق اکبر کی صفائی حضور کی براءت کو بدرجہ اولیٰ مستلزم۔ لہذا ''واللیل'' کو مقدم کرنے میں یہ حکمت ہے کہ ایک ساتھ دونوں ذاتوں سے طعن کر دفع کیا جائے، موخر کیا جاتا تو صدیق سے طعن کا دفاع بھی موخر ہو جاتا۔

تیسرا نکتہ: صدیق سے متعلق سورت کا نام ''واللیل'' ہے بمعنی رات، جس میں آدمی کو سکون واطمینان ملتا ہے، اور حضور سے متعلق سورت کا نام ''والضحیٰ'' ہے بمعنی دن، جس میں روشنی اور نور حاصل ہوتا ہے تاکہ اس جانب اشارہ ہو کہ حضور صدیق اکبر کے لیے نور وہدایت ہیں۔ اور صدیق اکبر حضور کے لیے راحت، سکون اور انس واطمینان نفس کا ذریعہ ہیں۔ نیز دین کا نظام دونوں ہستیوں سے قائم ہے جس طرح دن رات کے ذریعہ نظام عالم۔ دن نہ ہوتا کچھ نظر نہ آتا۔ اور رات نہ ہوتی تو سکون وقرار نہ ملتا۔ سبحان اللہ

یہاں قاضی ابوبکر باقلانی نے صدیق اکبر کی مولیٰ علی پر فضیلت کے سلسلہ میں ایک اور نکتہ بیان کیا ہے۔ وہ یہ کہ ایک آیت میں ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کا راہ خدا میں فقرا کو کچھ دینا اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے خوف کے سبب ہے۔ مگر حضرت صدیق اکبر کا مساکین کو عطیہ محض

رضائے الٰہی کے لیے ہے،اور بس۔لہذا آپ کا مقام ارفع واعلیٰ ہوا۔

آخر میں سیدنا اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں: تمام صحابہ مراتب ولایت میں دوسروں سے ممتاز ہیں مگر ان کے آپس میں مختلف مراتب ہیں۔ایک فضیلت دوسری پر فوقیت رکھتی ہے۔صدیق اکبر کا مقام اتنا بلند ہے کہ وہاں نہایتیں ختم ہیں۔

امام شیخ ابن عربی ''فتوحات مکیہ'' میں فرماتے ہیں: آپ کا مقام بس منصب نبوت سے فوراً نیچے ہے،حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور آپ کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔

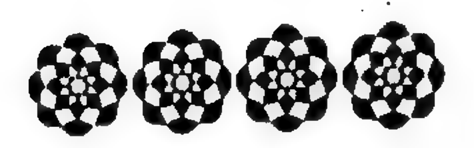
یہ ہے کتاب کا قدرے تعارف وخلاصہ۔اگر تحقیق وتدقیق اور علم وعرفان کے چھلکتے جام، بہتے دریا اور لہریں لیتے سمندر سے فیض حاصل کرنا چاہتے ہو تو کتاب کے ورق الٹیے اور توفیق الٰہی اور عطیہ رسالت پناہی کے دیدار پرانوار سے اپنے آپ کو شادکام کیجیے۔

وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ خیر خلقہ محمد وآلہ وصحبہ أجمعین. برحمتک یا أرحم الراحمین.

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی

۱۱رمحرم الحرام ۱۴۳۵ھ

بروز یکشنبہ بوقت ۲ر بجکر ۴۵رمنٹ دن



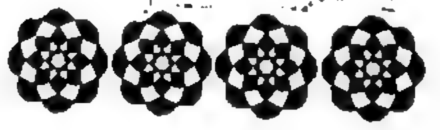
اردو ترجمہ

الزلال الأنقیٰ من بحر سبقة الأتقیٰ

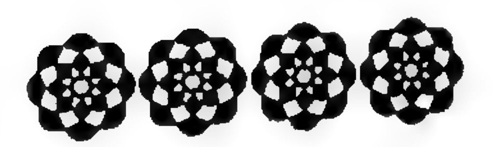
(یعنی سبقت اتقی کے سمندر سے انتہائی پاکیزہ آبِ خوش گوار)

مترجم

محمد حنیف خاں رضوی بریلوی



اجمالی فہرست



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان رحم والا

قال تعالیٰ: ﴿وَابتغوا الیہِ الوَسِیلَۃَ﴾

ترجمہ: اور اس کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔

کسی پاکیزہ بلند رتبہ کی سب سے پسندیدہ و محمود رضا، ستھرے پاکیزہ حضرت علی کی یہ رضا ہے کہ انھوں نے خود اپنے اوپر بلند درجات میں شیخین کو فضیلت دی، یہ دونوں ہستیاں بزرگ و برتر ہونے کے ساتھ جوار رسول میں آرام فرما ہیں، یہ اہل ایمان کے امیر ہیں اور دربار رسول کے وزیر۔ حضرت علی مرتضیٰ نے اس افضلیت کو صاف الفاظ میں بیان فرمایا اور واضح کلمات سے روشن کیا، نیز کھلے لفظوں میں بیان کر کے اس طرح ظاہر فرمایا کہ آپ نے اپنی زبان اقدس سے دونوں حضرات کے فضل و کمال کے اعتراف کی دعوت دی اور اپنی قلبی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے تصریح فرمائی۔ اس لیے کہ بحمدہ تعالیٰ مولائے کائنات امیر المؤمنین حضرت علی مرتضیٰ کی ذات گرامی کبر و غرور سے پاک اور جاہ و حشمت کی طلب سے بے نیاز تھی۔

میں ان کی ایسی تعریف و توصیف بیان کرتا ہوں جس کے ذریعہ مجھے مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف بیان کرنے کا لطف حاصل ہو۔ مصطفیٰ جان رحمت عظمتوں کے حامل، کمالات کی زینت اور عظیم فضائل کے مالک ہیں، آپ ہی کی ذات اقدس سے فضائل کا آغاز ہے اور آپ ہی ان کا مرجع ہیں، فضائل آپ کی طرف منسوب ہو کر آپ ہی پر منتہی ہوتے ہیں۔

میں آپ کی نعت پاک ایسی خوبیوں کے ضمن میں بیان کرنا چاہتا ہوں جو میرے لیے اس واحد و یکتا کی حمد کے عظیم درجہ تک پہونچنے کا ذریعہ اور وسیلہ ہو جائے، اسی کے لیے تمام تر خوبیاں ہیں: قلیل و کثیر، اول و آخر، ظاہر و باطن ہر طرح کی۔ وہ جسے چاہتا ہے بلند فرماتا ہے اور جسے چاہتا ہے پست کرتا ہے۔ اس لیے کہ فضل و کرم کی ترازو اس کے دست قدرت میں ہے، میں یہ سب کچھ عرض کرتے ہوئے حمد باری تعالیٰ کے میدان میں اترتا ہوں اور اس طرح آغاز کرتا

ہوں کہ:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اسی کے لیے ہیں تمام خوبیاں اول و آخر۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تمام بلند و بالا خوبیاں اللہ تعالیٰ کے لیے جو تمام جہان کا پالنے والا ہے کہ اس نے ہمارے نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی، اور انہیں قیامت کے دن گنہ گاروں کا شفیع مقرر کیا، اور ہر مومن جس نے ان کو دیکھا خواہ ایک لمحہ دور سے ہی تمام اے وسیع فضل دیا، اور صحابہ کرام میں سے کسی کی تنقیص اور گستاخی میں جو بھی مبتلا ہوا اس کو دوزخ کے کھولتے پانی اور غذا میں آگ کے کانٹوں کی وعید سنائی۔ ان صحابہ کرام میں سے چار عظمت والے حضرات کو انوکھے انداز سے چن لیا جو اسلام کی اصل اور لوگوں کے امام ہیں۔ خلافت کی ترتیب ان کی فضیلت کی ترتیب پر رکھی۔ بے شک جس نے اس ترتیب کے برعکس کہا اس نے بری طرح الٹ پلٹ کیا۔

حمد کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے درود و سلام اور برکت و رحمت نازل ہو اس ذات گرامی پر جو دلوں کے پیارے اور گناہ گاروں کے چارہ ساز ہیں، اور ان کی پاک آل اور نیک صحابہ پر، یقیناً وہ دیکھنے سننے والا ہے، ایسا عظمت والا درود جس کے پیچھے سلام بھی ہو، اور ایسا عزت والا سلام جس کے بعد درود ہو۔ درود و سلام کے ساتھ برکت و افزائش کی مشایعت ہمیشہ رہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا ان کا آقا و مولیٰ ہے، وہ کس قدر بلند و برتر اور عظیم و جلیل ہے، یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔ وہی رفعت والا معبود ہے اور بے شک محمد اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں، اس کی رحمت اور اس کی عطا ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو جمال و کمال بخشا، دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ ہر برائی کو مٹائیں اور تمام ادیان باطلہ پر جلد غالب آجائیں۔

حمد و صلاۃ کے بعد اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو یہ ایک بلند عطیہ، قیمتی سرمایہ، اور رب کی رحمت ہے، نہ کہ کوئی شیطانی وسوسہ، اس کے اوراق دیکھنے میں قلیل، لیکن اگر ان کو دل میں محفوظ کرلیا جائے تو عظیم و جلیل، جب ان کو پڑھا جائے تو آسان اور ذہن نشین کیا جائے تو سہل، اگر انصاف کیا جائے تو عقیدہ میں آرائش کا سامان ہو، اور اگر تعصب کی آنکھ سے دیکھا جائے تو پھر اس کے

مضامین فہم سے دور اور الگ تھلگ ہو جائیں۔

یہ کتاب اپنے معانی ومفاہیم کی عظمت وجلالت کے اعتبار سے بلند وبالا باغوں کے مناظر پیش کرتی ہے، جن کے خوشے جھکے ہوئے، ان میں اونچے اونچے تخت رکھے ہوئے، ان پر کوزے چنے ہوئے، قالین بچھے ہوئے اور چاندنیاں پھیلی ہوئی، جن کی بادنسیم عظیم القدر فضلائے عصر کی پسندیدگی ہے اور ان کی زینت، حاسدوں کی جانب سے ردو انکار ہے، علم وعرفان کے اس لہلہاتے گلستاں میں ہر قسم کے پھل ہیں۔

ان باغات کے میوے کیا ہیں؟ تحقیق کے انگور، تدقیق کی پکی کھجوریں، حقائق کے اخروٹ اور دقائق کے بادام، یہ باغات محبین اور حاسدین دونوں فریقوں کو پھل دیتے ہیں، ایک مرتبہ اہل سنت کو خوش ذائقہ اور میٹھا پھل۔ دوسری مرتبہ بد مذہبوں اور گمراہوں کو بدمزہ اور کڑوا جو مہلک ہوتا ہے، اس میں بہتے چشمے اور نہریں ہیں جن کا نام سلسبیل ہے، اگر سیراب ہونا چاہتے ہو تو کھڑے ہو جاؤ اور اس کا راستہ معلوم کرو۔

ان کا پانی صاف، شفا بخش، اور پینے والے کے لیے عمدہ، خوب خوب سیراب کرنے والا، اور جو اس سے بچے اور دور رہے اس کے لیے زہر قاتل۔ تو یہ کیسی خوبیوں والی جنت ہے کہ جس کے سایہ میں انسانوں اور جنوں کے لیے گمراہی کی دھوپ اور ہٹ دھرمی کی آگ سے امان ہے، اس کی جڑ جمی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں آسمان میں ہیں۔

اس جنت اور باغ کی آب یاری کرنے، پھول کھلانے، پھل توڑنے اور چننے والا اللہ رب العزت کا ناکارہ بندہ اور ہر چیز میں اس کا محتاج عبد المصطفیٰ احمد رضا ہے، یہ اپنے دین میں محمدی، مذہب میں حنفی، نسبت میں قادری، مشرب میں برکاتی اور سکونت میں بریلوی ہے، نیز۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ مدفن میں مدنی بقیعی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشگی کے وطن میں جنتی عدنی وفردوسی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرمائے، امیدیں برلائے، اعمال درست فرمائے اور اس کی آخرت کو دنیا سے بہتر فرمائے۔ یہ (احمد رضا) بیٹا ہے جلیل القدر امام، فضل وکمال کے موجیں مارتے اتھاہ سمندر، ماہ تمام، حامی سنن، ماحی فتن، دلکش، فائق، عمدہ، بلند، لطیف، نظیف تصنیفات وتالیفات والے، اسلاف کی نشانی اور معاصرین کے لیے حجت، خیر خواہ امت، دافع کربت،

گمراہوں کے مکر وفریب سے بارگاہ رسالت کے محافظ ہیں، ان کی عظیم جناب میں معذرت کرتے ہوئے عرض کرتا ہوں:

ترجمہ اشعار:

بخدا میری تعریف ان کے کمال تک نہ پہنچ سکی۔

مگر میری عاجزی ہی ان کے کمالات کی بہترین تعریف ہے۔

وہ سمندر ہیں مگر سمندر کا کنارہ ہوتا ہے اور یہ بحر بے کراں ہیں۔

وہ فضل وکمال کا ایسا ماہ تمام ہیں جسے گھٹنے اور ناقص ہونے کا اندیشہ نہیں۔

میرے سردار، میرے آقا، میری سند اور میرا ٹھکانا، کوہ علم اور علامۂ عالم مولانا مولوی محمد نقی علی خان قادری برکاتی احمدی آل رسولی۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہو اور انہیں راضی کرے اور تازگی وفرحت عطا فرمائے۔

آپ صاحب زادے ہیں عارف باللہ کے جو مدبر امور، سردار قوم، کریم وسخی، اہل تقوی کے سورج، صاحبان تقدس کے ماہ تمام، نجم ہدایت، علامہ خلقت، صاحب برکات کثیرہ وکرامات مشہورہ متواترہ، مالک درجات عالیہ ومنازل بدیعہ، میں نے ان کی شان میں امیدوار کرم ہو کر عرض کیا:

ترجمہ اشعار:

جب علم وعمل کی فضیلت کا انسان مالک نہ ہو تو پھر نسب کچھ کام نہیں دیتا۔

کیا میل کچیل بھی چنا جاتا ہے، خواہ سونے سے نکلا ہوا میل کچیل ہو۔

لیکن میں آپ کی رضا وخوشنودی کی امید رکھتا ہوں۔

اے رضا، آپ تو خود رفیع اور بلند ہیں، لہذا مجھ کو بھی عالی رتبہ عنایت فرمائیں۔

میری امان اور حرز جان، میرا ذخیرہ اور خزانہ، بلند قدر وفخر والے مولانا مولوی رضا علی خاں نقش بندی ۔قدس اللہ سرہ وافاض علینا برہ۔ آمین یا رب العلمین۔

باعث تصنیف:

زیر مطالعہ کتاب کی تصنیف اور نہایت مدلل اور خوبصورت انداز میں جمع وتالیف پر مجھے

اس بات نے ابھارا کہ میں نے خود دیکھا کہ اس دور میں کچھ لوگوں کے دل بہکے، قدم پھسلے اور خیالات اس امر سے منحرف ہوئے جس کے نشانات انتہائی بلند اور سب سے اونچی چوٹی پر نصب تھے۔ اس لیے کہ اس کا ثبوت کثیر آیات، بے شمار احادیث اور صحابہ کرام و اہل بیت اطہار، اولیائے کرام و علمائے عظام کے متواتر اقوال سے موجود تھا، یعنی شیخین کی مولیٰ علی پر فضیلت۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین ۔وجعلنا لھم ومنھم۔

یہاں تک کہ مجھے یہ خبر ملی کہ بعض وہ لوگ جو بے اعتبار ظن وتخمین کے شکار ہوئے۔ ان کا گمان فاسد ایسے لوگوں کی اقتدا اور اتباع کی طرف لے گیا جو علم سے کورے تھے، لہذا ان کی اندھی تقلید میں قیمتی دلائل کو نا قابل اعتبار ٹھہرا کر ردی اور کمزور دلائل کو اختیار کیا، پھر ایسے کمزور شبہات کا سہارا لیا جن میں نہ کوئی عمدہ اور نہ ستھرا، ان کی مثال تو ایسی ہے جیسے کانٹوں کی غذا کہ نہ تندرست بنائے اور نہ بھوک مٹائے، یہ شبہات انھوں نے آیت کریمہ: ﴿وَسَیُجَنَّبُهَا الأَتْقَى﴾ (اور اس سے بہت دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیز گار ہے) سے افضلیت صدیق اکبر کے ثبوت پر جرح کرتے ہوئے پیش کیے جب کہ اہل تقویٰ ائمہ اور پاکیزہ پیشوایان امت اس آیت کریمہ سے صدیق اکبر کی افضلیت کے اثبات پر متفق ہیں۔

ان سارے یا بعض شبہات کو ہمارے ہم عصر ایک فاضل کے یہاں ایک ایسے شخص نے پیش کیا جو زبردستی اہل ذکاوت کی صف میں در آیا ہے، یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ بحث ومباحثہ کہاں تک پہنچا اور کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ یہ واقعہ میرے لیے غیر معمولی تھا، اور مجھ پر بہت گراں گزرا، اس لیے میں نے اس موضوع پر ایک ایسی کتاب لکھنے کے سلسلہ میں استخارہ کیا جو ہر شک وشبہ کا جواب ہو، اور جس سے حق کا روئے تاباں بے نقاب ہو۔ حالاں کہ میں اپنی کم مائیگی اور کوتاہ دستی سے باخبر ہوں، اور میرے پاس تفسیر کی کتابیں بھی بہت کم ہیں، علاوہ ازیں جو شدتیں میں برابر جھیل رہا ہوں وہی اس کام کی راہ میں رکاوٹ بننے کے لیے بہت ہیں۔ یعنی ہر طرح کے رنج وغم کا ہجوم، الگ الگ اغراض ومقاصد کی جانب توجہ، عوارض کا پیہم ورود، موذی والم رساں کی کارفرمائی جس سے کسی مومن کے لیے رہائی نہیں، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے خبر دی۔ مگر اس فقیر مشقت آزما نے محسوس کیا کہ میرے اوپر معانی نفیسہ کا چشمہ رواں ہے، اور

پورے جوش کے ساتھ اُمڈ رہا ہے، اس کے باعث میرا یہ گمان قوی ہوگیا کہ مالک توفیق اس ناتواں کو اس کی قوت مرحمت فرمائے گا جو اس کی طاقت سے باہر ہے۔ چناں چہ میں نے ماہ مبارک ذوالحجہ کے آخری پانچ ایام میں اپنی تدبیر سے فرصت کا موقع نکالا اور بحمدہ تعالیٰ اب یہ کتاب اس خوبی کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچی کہ نگاہوں کی دل کشی اور بصیرتوں کی روشنی کا باعث ہے، اس نے خوب صورت معانی الفاظ کے ضمن میں اس طرح کھول کر بیان کیے کہ کانوں نے نہ سنے، اسی طرح اس میں تحقیق کی پاکیزہ صورتیں اور تدقیق کی آراستہ عروسیں جلوہ گر ہیں جن کو مجھ سے پہلے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا اور نہ جن نے۔ اگر میرا خیال درست ہے تو ہر وہ بات جو میں نے کسی حوالہ کے بغیر کہی ہے وہ میری فکر قاصر کا نتیجہ اور نظر کوتاہ کا ثمرہ ہے۔ تم جانتے ہو کہ انسان خطا و نسیان کا ہم دم ہے، لہٰذا جس بات کو حق و صواب پاؤ اس کو اللہ رحمٰن کی طرف نسبت کرنا۔ میں ایسی باتوں میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے ثواب کا امیدوار ہوں۔

اور اس کتاب میں جو خطا نظر آئے وہ میری اور شیطان کی طرف سے ہے۔ میں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں شیطان کی برائیوں سے براءت چاہتا ہوں۔

ہر لفظ و معنی میں خطا سے عصمت خدا کو اپنی کتاب عظیم اور اپنے رسول کے کلام کریم کے سوا کسی کے لیے منظور نہیں۔

چوں کہ اس کتاب کے اختتام کی مہر اس رات میں لگی اور اس کا ماہ تمام اس رات طلوع ہوا جو تیرھویں صدی ہجری (۱۳۰۰ھ) کی آخری رات تھی، لہٰذا اس مناسبت سے میں نے اس کا تاریخی نام "الزلال الانقیٰ من بحر سبقة الاتقی" رکھا، (یعنی سبقت اتقی کے سمندر سے انتہائی پاکیزہ آبِ خوش گوار) تاکہ یہ نام تصنیف کے سال کی نشانی ہو جائے، اللہ تعالیٰ ہی ولی نعمت ہے۔ کتب دینیہ میں یہ میری پندرھویں تصنیف ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اور تمام مسلمانوں کو اس سے نفع بخشے، اس کو میرے آگے کے کاموں کے لیے نور بنائے اور میرے موافق حجت فرمائے، میرے خلاف نہیں۔ بے شک وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اور دعا قبول فرمانا اسی کی شان ہے۔

حسبنا اللہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

۲۷۔ شوال المکرم ۱۴۳۲ھ بروز شنبہ

محمد حنیف خاں رضوی

مقدمہ اولیٰ

فضائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

أعوذُ باللهِ مِنَ الشَّيطَانِ الرَّجِيم

ہمارے رب تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يٰأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَّأُنثَىٰ وَجَعَلْنٰكُم شُعُوباً وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ، إِنَّ أَكرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتقٰكُم ؛ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيم خَبِير﴾ [سورة الحجرات:١٣]

اے لوگو ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں شاخیں اور قبیلے کیا کہ آپس میں پہچان رکھو بے شک اللہ کے یہاں تم میں زیادہ عزت والا وہ جو تم میں زیادہ پرہیز گار ہے۔ بے شک اللہ جاننے والا خبردار ہے۔ (ترجمہ رضویہ)

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل جاہلیت کے اس مذموم طریقہ کا رد فرمایا جو ان کے یہاں رائج تھا کہ اپنے باپ دادا پر فخر کرتے، دوسروں کے نسب میں طعن کرتے اور اپنے نسب کی بڑائی دوسروں پر اس طرح ظاہر کرتے تھے کہ گویا وہ ان کے غلام یا اس سے بھی ذلیل تر ہیں۔ اس قبیح حرکت کا موجد ذلیل وکمین ابلیس لعین ہے جس نے اللہ رب العزت سے کہا تھا: میں تو آدم سے بہتر ہوں، کہ تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے بنایا۔ لہذا اہل جاہلیت کے اس خیال کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح رد فرمایا کہ تمہارا باپ ایک، تمہاری ماں ایک، اس لیے کہ خدائے برتر نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سارے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا، تو تم میں سے ہر ایک کا سلسلہ نسب آدم اور حوا تک یکساں پہونچتا ہے، تو اب نسب میں فضیلت اور ماں باپ پر فخر کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی، ہاں ہم نے تمھیں چند گروہ میں تقسیم کیا جن کے نیچے ان کی شاخیں اور ان کے تحت چند قبیلے رکھے تا کہ تم آپس میں پہچان قائم رکھو اور صلہ رحمی کرو، اور کوئی اپنے باپ کے علاوہ کی طرف اپنی نسبت نہ کر

ے۔یہ تقسیم اس لیے نہیں کی کہ آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرو اور ایک دوسرے کو حقیر جانو، ہاں اگر تم فضیلت میں مقابلہ کرنا چاہتے ہو تو اس کی بنیاد ہمارے یہاں تقویٰ اور پرہیزگاری پر ہے۔ لہٰذا انسان میں جتنا تقویٰ زیادہ ہوگا اتنا ہی وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں معزز ومکرم ہوگا۔ ہما رے یہاں زیادہ عزت والا وہی ہوگا جو زیادہ تقویٰ رکھتا ہو نہ وہ جو نسب میں برتر ہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ قلوب کی عزت اور ان کی پرہیزگاری کو خوب جانتا ہے، نفسوں کی خواہشات اور ارادوں سے باخبر ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا: یہ آیت ثابت بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی جب انہوں نے کسی شخص سے کہا تھا جس نے انہیں مجلس میں جگہ نہ دی کہ (اے فلانی عورت کے بیٹے) حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ازراہ حقارت فلانی عورت کا بیٹا کہنے پر فرمایا: یہ حقارت آمیز جملہ کہنے والا کون؟ حضرت ثابت نے عرض کیا: میں یارسول اللہ! فرمایا: اچھا تم اہل مجلس کے چہروں کی طرف نظر ڈالو، انہوں نے دیکھا تو حضور نے فرمایا: اے ثابت تم نے کیا دیکھا؟ بولے: یارسول اللہ! ان میں بعض سرخ اور بعض سفید وسیاہ چہرے والے ہیں، فرمایا: سنو! تمہیں ان پر صرف دین داری اور تقویٰ کی بنیاد پر ہی فضیلت حاصل ہوسکتی ہے۔ لہٰذا یہ آیت ﴿ یٰاَیُّھَا النَّاسُ، إلی قولہ. عَلِیمٌ خَبِیرٌ﴾ ان کے بارے میں نازل ہوئی۔ اور جس نے مجلس میں جگہ نہ دی اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿یٰأَیُّھَا الَّذِینَ آمَنُوا إِذَا قِیلَ لَکُم تَفَسَّحُوا فِي المَجَالِس فَافسَحُوا﴾
(اے ایمان والو جب تم سے کہا جائے مجلسوں میں جگہ دو تو جگہ دو)۔

امام مقاتل نے اس کی شان نزول یوں بتائی کہ فتح مکہ کے دن رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت بلال کو اذان دینے کا حکم فرمایا، تو وہ کعبہ مقدسہ کی چھت پر چڑھے اور اذان کہی، اس پر عتاب بن اسید بن ابی العیص نے کہا: الحمد للہ میرے باپ یہ دن دیکھنے سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔ حارث بن ہشام نے کہا: کیا اس کالے کوے کے علاوہ اذان پڑھنے کے لیے محمد کو کوئی اور نہیں ملا (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم)۔ سہیل بن عمرو نے کچھ احتیاط سے گفتگو کرتے ہوئے کہا: اگر اللہ تعالیٰ کو اس طریقہ کے سوا کچھ اور پسند ہوگا تو وہ اس کو بدل دے گا، لیکن

ابوسفیان بولے: میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا، کیوں کہ مجھے یہ خطرہ ہے کہ آسمان کا رب محمد۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ۔ کوان باتوں کی خبر دے دے (اور ہمیں زجر وتوبیخ کا سامنا ہو) چناں چہ ایسا ہی ہوا، حضرت جبریل آئے اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کوان باتوں کی خبر دی۔ حضور نے ان کو بلا کر پوچھا تو ان لوگوں نے اقرار کیا، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی جس میں انہیں نسب پر فخر، مالوں پر گھمنڈ اور فقرا کی تحقیر سے منع فرمادیا۔

علامہ نسفی نے مدارک میں زمخشری کی تفسیر کشاف کی تبعیت میں کہا کہ یزید بن شجرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مدینہ کے ایک بازار سے گزر فرمایا تو ایک سیاہ فام غلام دیکھا جو یہ کہہ رہا تھا: کون ہے جو مجھے اس شرط پر خرید لے کہ مجھے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے پیچھے پانچوں وقت کی نماز سے منع نہ کرے، ایک شخص نے اس کو خرید لیا، جب وہ مریض ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس کی عیادت کو تشریف لے گئے، پھر جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کے دفن میں بھی شرکت فرمائی، صحابہ کرام نے اس کی کم حیثیت کے پیش نظر کوئی ہلکا جملہ کہا تو یہ آیت اتری۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آیت کا مفاد نسب پر فخر سے باز رکھنا اور یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اعزاز واکرام تقویٰ سے حاصل ہوگا، چنانچہ جو متقی نہیں اس کے لیے عزت وکرامت سے کوئی حصہ بھی نہیں۔ واضح رہے کہ تقویٰ کی بالکلیہ نفی کافر ہی سے درست ہے کیوں کہ ہر مومن کم از کم بایں معنی تو ضرور صاحب تقویٰ ہے کہ وہ کفر وشرک سے ضرور بچتا ہے جو اکبرالکبائر ہے۔ لہذا جو متقی ہو وہ معزز ہوگا، اور جو اتقی (زیادہ تقویٰ والا) ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اکرم (زیادہ معزز) ہوگا۔

ہوسکتا ہے یہاں بعض لوگوں کو یہ گمان ہو کہ آیت کریمہ کی شان نزول کے سلسلہ میں ان تمام روایات کا ذکر بے محل ہے، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ ہمارے دعوی کے اثبات میں یہ روایات نفع بخش ثابت ہوں گی، اور ہم ان کے ذریعہ بعض اوہام کا زور توڑیں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔ جیسا کہ تم جلد ہی دیکھو گے، لہذا انتظار کرو۔ ابھی تو یہ پہلا مقدمہ ہے۔

مقدمہ ثانیہ

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿ وَسَيُجَنَّبُهَا الأتقىٰ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ . وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجزىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الأعلىٰ . وَلَسَوْفَ يَرضىٰ ﴾[سورة الليل:۱۷،۱۸،۱۹]

اور اس سے بہت دور رکھا جائے گا جو سب سے بڑا پرہیز گار ہے جو اپنا مال دیتا ہے کہ ستھرا ہو اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، صرف اپنے رب کی رضا چاہتا ہے جو سب سے بلند ہے اور بے شک قریب ہے کہ وہ راضی ہو۔(ترجمۂ رضویہ)

اہل سنت وجماعت کے مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ یہ آیت کریمہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس ''اتقی'' سے آپ ہی مراد ہیں۔

ابن ابی حاتم اور طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے ایسے سات غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے سلسلہ میں ستائے جاتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔ یعنی (سیجنبھا) سے آخر سورت تک۔

امام بغوی فرماتے ہیں کہ حضرت عروہ بن زبیر کی روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کمزور غلاموں کو خریدتے اور پھر ان کو آزاد کر دیتے، ایک دن ان کے والد ابو قحافہ نے کہا: اے بیٹے! تم اگر ایسے طاقت ور غلاموں کو خریدتے جو تمہاری حفاظت کرتے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوتا، آپ نے فرمایا: میں اپنی حفاظت ہی کے لیے ایسا کرتا ہوں۔ اس وقت یہ آیت آخر سورت تک نازل ہوئی۔

محمد بن اسحاق نے ذکر کیا کہ بلال بن رباح قبیلہ بنو جمح کے ایک شخص کے غلام تھے، ان کی ماں کا نام حمامہ ہے، آپ اسلام میں سچے اور دل کے ستھرے تھے، امیہ بن خلف کے غلام تھے، اس خبیث امیہ کا یہ طریقہ تھا کہ آپ کو تپتی ہوئی دوپہر میں گھر سے باہر لے جا کر گرم ریت پر لٹا دیتا، اور پھر ایک بھاری پتھر ان کے سینے پر رکھوا دیتا، اور کہتا تم ایسے ہی پڑے رہو یہاں تک کہ

مر جاؤ، یا۔ پھر محمد کے کلمہ سے انکار کر دو، مگر آپ اس مشکل کے وقت بھی فرماتے: (احدٌ احدٌ) اللہ ایک ہے، اللہ ایک ہے۔

محمد بن اسحاق نے دوسری روایت ہشام بن عروہ سے بیان کی کہ وہ اپنے والد حضرت عروہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گذر ایک دن بلال کے پاس سے ہوا جب ان پر وہی ظلم ہو رہا تھا، حضرت صدیق کا گھر بھی قبیلہ بنو جمح کے قریب تھا۔ آپ نے امیہ بن خلف سے کہا: اس مسکین وناتواں پر ظلم ڈھانے سے باز آ، اور اللہ سے ڈر، بولا: تم نے ہی اس کو خراب کیا ہے، اگر اتنا خیال ہے تو اس کو مصیبت سے چھڑالو، آپ نے فرمایا: اچھا سن! میرے پاس ایک سیاہ فام طاقت ور غلام ہے جو تیری طرح بے دین ہے، کیا بلال کے بدلہ اس کو لے گا؟ بولا: مجھے منظور ہے، لہذا آپ نے یہ تبادلہ کر لیا اور پھر بلال کو آزاد کر دیا۔ اسی طرح اسلام لانے کی بنیاد پر آپ نے ہجرت سے قبل مزید چھ غلام آزاد فرمائے، ان میں ساتویں حضرت عامر بن فہیرہ تھے جو بدر واحد میں حاضر ہوئے، اور واقعہ بیر معونہ میں شہید ہوئے، اسی طرح ام عمیس کو بھی آپ نے آزاد کیا، اور زنیرہ نامی ایک باندی کو بھی خرید کر آزاد فرمایا: یہ آزاد ہوئی تو نابینا ہو گئی، کفار قریش نے طعنہ دیا کہ ہمارے معبودوں یعنی لات وعزیٰ نے اس کو اندھا کر دیا، اس نے کہا: کعبہ کی قسم! قریش جھوٹے ہیں، یہ بت نہ کسی کو نقصان پہونچا سکیں اور نہ فائدہ، اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی واپس فرمادی۔ اسی طرح صدیق اکبر نے نہدیہ اور ان کی بیٹی کو آزاد فرمایا، یہ دونوں قبیلہ بنو عبد الدار کی ایک عورت کی باندیاں تھیں، صدیق اکبر کا ان کے پاس سے اس وقت گذر ہوا جب ان دونوں سے نہایت سختی کے ساتھ وہ عورت آٹا پسوا رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ خدا کی قسم! تمہیں کبھی آزاد نہیں کروں گی، آپ نے یہ سن کر فرمایا: اے ام فلاں! قسم توڑ دے! بولی: میں قسم توڑتی ہوں، تم نے ان دونوں کو بگاڑا ہے تو تم ان دونوں کو خرید کر آزاد کر دو، آپ نے فرمایا: میں نے خرید لیا اور قیمت ادا کرنے کے بعد آزاد فرمادیا۔ اسی طرح آپ کا گزر قبیلہ بنی مؤمل کی ایک باندی کے پاس سے ہوا جب اس پر ظلم ہو رہا تھا، تو اسے بھی خرید کر آزاد فرمادیا۔

افضل التابعین حضرت سعید بن میتب فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی کہ امیہ بن

خلف سے حضرت بلال کے معاملہ میں جب حضرت صدیق نے فرمایا: کیا اسے بیچو گے؟ تو اس نے کہا: ہاں، میں آپ کے غلام نسطاس کے بدلہ میں بلال کو آپ سے بیچ دوں گا، نسطاس حضرت صدیق اکبر کا ایسا غلام تھا جو خود دس ہزار دینار، اور بہت سے غلاموں، باندیوں، اور چوپایوں کا مالک تھا لیکن مشرک تھا، صدیق اکبر نے اسے بہت سمجھایا اور فرمایا: تو اسلام لے آ، میں تجھے آزاد بھی کر دوں گا اور یہ سارا مال تیرا ہی رہے گا لیکن اس نے انکار کر دیا، اسی دن سے آپ کو یہ غلام نہایت ناپسند تھا، جب امیہ بن خلف سے تبادلہ کے سلسلہ میں بات ہوئی تو آپ نے موقع غنیمت جانا اور تبادلہ کر لیا اور پھر حضرت بلال کو آزاد کر دیا۔ یہ واقعہ سن کر مشرکین مکہ نے کہا: ابوبکر نے یہ کام اس لیے کیا کہ ابوبکر پر بلال کا کوئی احسان تھا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعمَةٍ تُجزىٰ﴾ اور اس پر کسی کا کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے۔

علامہ ابوالسعود نے اپنی تفسیر میں بیان کیا کہ حضرت عطا اور حضرت ضحاک دونوں نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت کی۔ اس روایت میں بلال کی خریداری اور آزادی کا ذکر ہے۔ کہتے ہیں: یہ دیکھ کر مشرکین بولے: ابوبکر پر بلال کا کوئی احسان ہی تھا جس کی وجہ سے انہوں نے آزاد کیا۔ اس وقت یہ آیت نازل ہوئی۔

ازالۃ الخفا میں حضرت عروہ سے روایت ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سات غلام اور باندیوں کو آزاد فرمایا، اور یہ سب وہ تھے جن کو اللہ تعالیٰ کے راستہ میں ستایا جا رہا تھا، وہ ساتوں یہ ہیں۔

(۱) بلال (۲) عامر بن فہیرہ (۳) نہدیہ (۴) ان کی بیٹی (۵) زنیرہ (۶) ام عمیس (۷) بنومؤمل کی باندی۔

انہیں کو آزاد کرنے کے سلسلہ میں ﴿سیجنبها الاتقی﴾ سے آخر سورہ تک کی آیتیں نازل ہوئیں۔

عامر بن عبداللہ بن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے روایت ہے، یہ اپنے والد حضرت عبداللہ بن زبیر سے روایت کرتے ہیں کہ صدیق اکبر کے والد ابوقحافہ نے آپ سے کہا: میں دیکھ

رہا ہوں کہ تم کمزور غلاموں کو آزاد کرتے ہو، اگر تم طاقتور غلاموں کو آزاد کرتے تو وہ تمہاری حفاظت کرتے اور تمہارے مقابلہ میں آنے والے دشمن سے سپر بن جاتے۔ آپ نے جواب دیا: اے والد! میں اللہ کی رضا کے سوا کچھ اور نہیں چاہتا۔ اس وقت ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى﴾ إلى قوله ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزٰى إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى، وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾ تک کی آیات نازل ہوئیں۔

حضرت سعید بن مسیّب نے فرمایا: یہ آیت ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزٰى﴾ حضرت ابوبکر صدیق کے بارے میں اس وقت نازل ہوئی جب آپ نے ایسے غلاموں کو آزاد فرمایا جن سے نہ کوئی بدلہ مقصود تھا اور نہ احسان چکانا، ان کی تعداد چھ یا سات ہے، ان میں بلال اور عامر بن فہیرہ بھی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت ہے کہ ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقٰى﴾ میں اتقی سے مراد حضرت ابوبکر صدیق ہیں۔

میں کہتا ہوں: ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضرت ابوبکر صدیق نے بلال کو امیہ بن خلف اور اُبی بن خلف سے ایک چادر اور دس اوقیہ کے عوض خریدا۔ (یعنی ۲۶ رتولے سے کچھ زائد) تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ اتاری ﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطٰى وَاتَّقٰى﴾ إلى قوله ﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِعْمَةٍ تُجْزٰى إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى، وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾۔

یعنی ابوبکر اور امیہ واُبی بن خلف کی کوششیں جدا جدا مقصد سے ہیں اور ان میں بہت بڑا فرق ہے۔

سیدنا صدیق اکبر کے بلال کو خریدنے اور آزاد کرنے کے سلسلہ میں سردار بن سردار عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے چند اشعار کہے تھے جن کا ترجمہ اس طرح ہے:

اللہ تعالیٰ حضرت ابوبکر کو بلال اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے اور ابوجہل کو رسوا اور ذلیل کرے۔

وہ شام یاد کرو جب ان دونوں نے حضرت بلال کا برا چاہا اور اس سے نہ ڈرے جس

سے ایک عقل مند آدمی ڈرتا ہے۔

ان لوگوں نے بلال کے ساتھ بدسلوکی اس لیے کی کہ بلال خدائے ذوالجلال کو ایک مانتے تھے، اور انھوں نے کہا تھا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ رب العزت میرا رب ہے اور میں اس پر مطمئن ہوں، تو اگر تم مجھے قتل کرنا چاہتے ہو تو قتل کر دو، مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ قتل کے خوف کی وجہ سے خدا کے ساتھ شرک کا ارتکاب کروں۔

تو اے ابرہیم کے رب! اور اپنے بندے یونس، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم الصلوٰۃ والسلام کے رب! مجھے اس آزمائش سے نجات دے اور بنی غالب میں سے اسے مہلت نہ دے جو گم راہی پر شیدا رہتا ہے، جب کہ اس کے پاس نہ کوئی نیک سلوک ہے نہ کوئی انصاف۔ (اس تحقیق کو یاد رکھو)

امام بغوی نے فرمایا "الا تقی" کی تفسیر میں تمام مفسرین کے اقوال کے مطابق صدیق اکبر ہی مراد ہیں۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں فرمایا: ہمارے اہل سنت مفسرین کا اس پر اجماع ہے کہ اتقی سے ابوبکر مراد ہیں۔

صواعق محرقہ میں علامہ ابن حجر مکی نے علامہ ابن جوزی سے نقل کیا: تمام علمائے کرام کا اس پر اجماع ہے کہ یہ صدیق اکبر کے بارے میں ہے۔ حتیٰ کہ طبرسی رافضی ہونے کے باوجود اپنی تفسیر مجمع البیان میں اس کا انکار نہ کر سکے۔ اور فضیلت وہی ہے جس کی گواہی دشمن بھی دیں۔ والحمد للہ رب العالمین۔

امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس آیت میں بھی اپنی عادت کے مطابق عقلی استدلال اور فکری کاوشوں سے ثابت فرمایا ہے کہ آیت کا مصداق صدیق اکبر کے سوا کسی اور کو قرار ہی نہیں دیا جاسکتا۔

فرماتے ہیں: تم جانتے ہو کہ تمام شیعہ اس روایت کے منکر ہیں اور وہ سب کہتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے لیے نازل ہوئی، اس کی دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُونَ﴾ یعنی اور وہ رکوع کی حالت میں زکاۃ دیتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے فرمان (الاتقی) سے اس پہلی آیت ہی کی طرف اشارہ ہے، ایک رافضی نے جب میرے سامنے یہ بات کہی تو میں نے کہا: میں اس پر دلیل عقلی قائم

کروں گا کہ اس آیت سے صرف ابوبکر صدیق ہی مراد ہیں۔ دلیل اس طرح ہے کہ اتقی سے مراد وہی ہے جو سب سے افضل ہے۔ اور اس صورت میں صدیق کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ جب یہ دونوں مقدمے درست ثابت ہوجائیں گے تو مقصود بھی حاصل ہوجائے گا، لہذا سنو! وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللّٰهِ أَتقاكُم ﴾ اس میں اکرم سے افضل ہی مراد ہے، تو بات صاف ہوگئی کہ جو اتقی ہوگا ضروری ہے کہ وہ افضل ہو، تو ثابت ہوگیا کہ سب سے بڑا پرہیزگار جس کا یہاں آیت میں ذکر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں افضل الخلق ہو۔ لہذا ہم کہتے ہیں کہ ضروری ہے کہ اس سے ابوبکر صدیق ہی مراد ہوں، اس لیے کہ ساری امت اس بات پر متفق ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد خلق سے افضل یا تو حضرت صدیق اکبر ہیں۔ یا۔ حضرت علی مرتضی۔ مگر اس آیت کا مصداق حضرت علی ہو نہیں سکتے، لہذا ابوبکر متعین ہوگئے، حضرت علی اس کا مصداق اس لیے نہیں ہوسکتے کہ ''اتقی'' کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعمَةٍ تُجزىٰ) اس پر کسی کا احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، یہ صفت حضرت علی پر صادق نہیں، اس لیے کہ وہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تربیت میں تھے، کیوں کہ حضور نے ان کو ابو طالب سے لے لیا تھا، حضور ہی ان کو کھلاتے، پلاتے، پہناتے اور پرورش فرماتے تھے، لہذا حضرت علی پر آپ کا ایسا انعام تھا جس کا بدلہ ان کے ذمہ لازم تھا، البتہ ابوبکر پر آپ کا کوئی دنیوی انعام نہ تھا بلکہ بسا اوقات صدیق اکبر حضور کا خرچ اٹھاتے۔ ہاں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا بہت بڑا احسان صدیق اکبر پر یہ تھا کہ اسلام کی طرف ہدایت ورہنمائی فرمائی، مگر یہ ایسا احسان تھا کہ اس کا بدلہ نہیں چکایا جاسکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ﴿وَمَا أَسئَلُكُم عَلَيهِ مِن أَجرٍ ان أَجرِيَ إِلَّا عَلىٰ رَبِّ العٰلَمِينَ﴾ [القرآن، ۱۹/۹۲]

لہذا ہم نے سمجھ لیا کہ اس آیت کا مصداق حضرت علی نہیں ہوسکتے، تو صدیق اکبر کا افضل امت ہونا واضح ہوگیا۔ ملخصاً۔

میں کہتا ہوں: امام رازی نے جو یہ فرمایا کہ حضرت علی حضور نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کی تربیت میں تھے اور حضور نے ان کو باپ سے لے لیا تھا، تو اس کا ثبوت یہ ہے کہ محمد

ابن اسحاق اور ابن ہشام نے اس بات کو ذکر کیا ہے، ابن اسحاق کہتے ہیں کہ مجھ سے عبداللہ بن ابی نجیح نے حدیث بیان کی، وہ روایت کرتے ہیں حضرت مجاہد بن جبر ابوالحجاج سے، انہوں نے کہا کہ حضرت علی پر اللہ تعالیٰ کا انعام اور ان کے ساتھ بھلائی یہ تھی کہ ایک مرتبہ قریش سخت تنگ دستی کے شکار ہوئے، چونکہ ابوطالب کی اولاد بہت تھی، اس لیے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس سے فرمایا۔ یہ بنی ہاشم میں بڑے مال دار تھے، اے چچا! آپ کے بھائی ابوطالب کی اولاد بہت ہے، اور یہ مشکل کا وقت آپ دیکھ رہے ہیں، لہذا آپ میرے ساتھ ابوطالب کے یہاں چلیے تاکہ ان پر سے ہم ان کی اولاد کا بوجھ کم کریں، ان کی اولاد سے ایک لڑکے کو آپ لے لیں اور ایک کو میں لے لوں۔ حضرت عباس نے کہا: آپ کی بات ٹھیک ہے، یہ دونوں حضرات ابوطالب کے یہاں پہنچے اور اپنا مدعا بیان کیا، ابوطالب نے کہا: عقیل کو میرے لیے چھوڑ دو اور تم جس کو چاہو لے جاؤ، لہذا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کو لیا اور سینے سے لگالیا۔ اور حضرت عباس نے جعفر کو سینے سے لگایا، لہذا حضرت علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو اعلان نبوت کا حکم سنایا، حضرت علی نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور ایمان قبول کرلیا، ادھر حضرت جعفر بھی حضرت عباس کی پرورش میں رہے یہاں تک کہ اسلام قبول کرلیا اور ان سے بے نیاز ہوگئے۔

میں کہتا ہوں: سرکار نے اس احسان عظیم کی تکمیل اپنی دختر پاک فاطمہ زہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شادی کے ذریعہ فرمائی۔

اور امام رازی کے کلام میں جو یہ ذکر آیا کہ بسا اوقات صدیق اکبر حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا خرچ اٹھاتے، تو اس بارے میں روایات نہایت واضح اور ظاہر ہیں اور احادیث وسیر کا علم رکھنے والے ان سے خوب واقف ہیں۔

(۱) امام احمد بن حنبل اور امام بخاری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں ابوبکر سے بڑھ کر مجھ پر کسی کا احسان نہیں کہ انھوں نے مجھے اپنی جان ومال سے نفع پہنچایا، اور اگر میں کسی کو

خالص دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا، مگر اسلامی دوستی بہتر ہے۔ میرے پاس اس مسجد میں آنے کے لیے جن کے دروازے مسجد میں کھلتے ہیں ابوبکر کے دروازہ کے سوا سب کے دروازے بند کردو۔

(۲) امام ترمذی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر کے سوا ہر شخص کے احسان کا بدلہ ہم نے اسے دے دیا، ہاں ابوبکر کا ہم پر وہ احسان ہے کہ اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ انہیں قیامت میں عطا فرمائے گا، نیز مجھے ابوبکر کے مال کے برابر کسی کے مال نے فائدہ نہ دیا، اور اگر میں کسی کو خالص دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن تمہارے صاحب (یعنی محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) اللہ تعالیٰ کے دوست ہیں۔

(۳) امام ترمذی نے ہی حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ ابوبکر پر رحمت نازل فرمائے کہ انہوں نے اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کیا اور مجھے اپنی سواری پر دار ہجرت مدینہ طیبہ میں لائے، بلال کو اپنے مال سے خرید کر آزاد کیا، اور اسلام میں مجھے کسی کے مال سے وہ فائدہ نہیں پہنچا جو ابوبکر کے مال سے پہنچا۔

(۴) امام احمد اور ابن ماجہ نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھے کبھی کسی کے مال نے وہ فائدہ نہ دیا جو ابو بکر کے مال نے دیا، یہ سن کر ابوبکر صدیق روئے اور عرض کیا، یارسول اللہ! علیک الصلاۃ والسلام، میں اور میرا مال آپ ہی کا تو ہے۔

(۵) امام طبرانی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مجھ پر ابوبکر سے بڑھ کر کسی کا احسان نہیں، انہوں نے اپنی جان اور مال سے میرا ساتھ دیا اور مجھ سے اپنی بیٹی کا نکاح کیا۔

(۶۔۱۱) ابویعلی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی مرفوع روایت ابن ماجہ کی روایت ابو ہریرہ کے الفاظ میں روایت کی۔ علامہ ابن حجر نے فرمایا: ابن کثیر نے بیان کیا کہ یہ روایت حضرت علی مرتضی، حضرت ابن عباس، حضرت جابر بن عبد اللہ اور ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بھی ہے۔ اور خطیب نے یہ روایت حضرت سعید بن مسیب

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرسلا بیان کی، اور اس میں یہ زیادہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صدیق اکبر کے مال میں ویسے ہی حکم (اور تصرف) فرماتے جیسے اپنے مال میں فرماتے۔

(١٢-١٣) ابن عساکر نے تاریخ میں متعدد سندوں سے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ اور حضرت عروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت ذکر کی کہ جس دن ابوبکر صدیق ایمان لائے ان کے پاس چالیس ہزار دینار تھے، دوسری روایت میں ہے چالیس ہزار درہم تھے، ابوبکر نے وہ سب حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر خرچ کر دیے۔

میں کہتا ہوں: یہ حدیث سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مروی ہے جیسا کہ امام ابن عدی نے کامل میں اس کی تخریج کی۔ (سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے اپنی سند حضرت انس تک اس طرح بیان کی)

ہمیں خبر دی مولیٰ ثقہ حجت مفتی حنفیہ مکہ مکرمہ امام الفقہاء والمحدثین سیدی واستاذی مولانا عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن عبدالرحمٰن سراج نے، یہ روایت کرتے ہیں جمال علمائے سلف خیر فی منصب الافتاء مولانا جمال بن عبداللہ عمر مکی سے۔ یہ روایت کرتے ہیں خاتمۃ الحفاظ والمحدثین مولانا محمد عابد بن شیخ احمد علی سندی ثم زبیدی ثم مدنی سے، یہ روایت کرتے ہیں مولیٰ محمد صالح فلانی عمری سے، یہ شیخ محمد بن سنہ فلانی فاروقی سے، یہ ہمارے آقا سید شریف محمد بن عبداللہ سے، یہ فاضل محدث سیدی علی اجہوری سے۔

یہ امام شمس الدین رملی سے، یہ شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری سے، یہ علامۃ الوری جبل الحفاظ شہاب الدین ابوالفضل احمد بن حجر عسقلانی سے، یہ ابوعلی محمد بن احمد مہدوی سے، یہ یونس بن ابی اسحاق سے، یہ ابوالحسن علی بن مقیر حنبلی سے، یہ کہتے ہیں کہ خبر دی ہم کو ابوالکرم شہرزوری نے، یہ کہتے ہیں خبر دی ہم کو اسماعیل بن مسعدہ جرجانی نے، یہ کہتے ہیں خبر دی ہم کو ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی جرجانی۔ اور۔ ابوعمرو عبدالرحمٰن بن محمد فارسی نے، یہ کہتے ہیں خبر دی ہم کو ابواحمد عبداللہ بن عدی جرجانی نے، یہ کہتے ہیں ہم کو خبر دی سعید بن کثیر بن عفیر نے۔ یہ کہتے ہیں ہم سے حدیث بیان کی فضل بن مختار نے، انہوں نے ابان سے۔ اور انہوں نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، حضرت انس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ

صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق سے فرمایا: تمہارا مال کتنا پاکیزہ ہے کہ اسی سے میرا موذن بلال ہے اور میری اونٹنی جس پر میں نے ہجرت کی اور تم نے اپنی بیٹی میرے نکاح میں دی اور اپنی جان و مال سے میری مدد کی، گویا میں دیکھ رہا ہوں کہ تم جنت کے دروازہ پر کھڑے ہو اور میری امت کی شفاعت کر رہے ہو۔

ہم نے ان دونوں فصلوں کے تعلق سے جن کی طرف حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان احادیث میں اشارہ فرمایا، یعنی یہ کہ صدیق اکبر نے اپنی جان و مال سے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مدد فرمائی، اپنی عظیم وجلیل کتاب "منتھی التفصیل لمبحث التفضیل" میں باب ثانی کی دو فصلوں میں مکمل تحقیق و تفصیل کے ساتھ کلام کیا ہے، چاہو تو اس کی طرف رجوع کرو۔

فاضل مفسر امام رازی نے اس مقام پر جو ذکر فرمایا تھا یہ اس کی تائید ہے، اور امام ابن حجر مکی نے بھی "صواعق محرقہ" میں اس کو ذکر فرمایا اور پسند کیا۔

میں کہتا ہوں: معترض اس مقام پر چار وجہوں سے بحث کرسکتا ہے جو دو وجہوں میں منحصر ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ صدیق اکبر پر کسی کا ایسا احسان نہ تھا جس کا بدلہ دیا جاسکے، اس لیے کہ انسان کے سب سے بڑے محسنوں میں اس کے ماں باپ ہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے ﴿أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ﴾ (میرا حق مان اور اپنے ماں باپ کا) اور یہ بات بخوبی معلوم ہے کہ شکر نعمت ہی کے مقابلہ میں ہوتا ہے، اور والدین کے احسانات دنیوی احسانات ہیں جن کا بدلہ دینا جاری وساری ہے، یہ دینی احسانات نہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَمَا أَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعٰلَمِينَ﴾ (اے محبوب تم فرماؤ میں تم سے اس پر کچھ اجرت نہیں مانگتا میرا اجر تو سارے جہانوں کے پروردگار پر ہے)

اس کے علاوہ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی خلافت عظمیٰ اور نیابت کبریٰ کامل ہو چکی تو ان کا دست کرم بالا اور سب جہانوں کے ہاتھ پست

ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت اور تمام نعمتوں کے خزانے اور اپنے فیض وکرم کے خوان ان کے ہاتھوں کے تابع کر دیے ہیں اور سب کچھ ان کو سونپ دیا جیسے چاہیں خرچ کریں، اور وہ اللہ تعالیٰ کے راز کا خزانہ اور اس کے حکم کے نافذ ہونے کا واسطہ ہیں، تو برکت انہی سے ملتی ہے اور خیر انہی سے حاصل ہوتی ہے جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ("إنَّما أنا قاسِم وَاللّٰهُ المُعطِي") میں بانٹتا ہوں اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے، لہذا آپ ہی تمام خیرات وبرکات، اور زمین وآسمان، ملک وملکوت کی ساری نعمتیں تقسیم فرماتے ہیں اور وہی اول وآخر اور ظاہر وباطن ہیں۔ جمہور علمائے کرام وفضلائے عظام اور مشہور اولیائے کرام کا اس پر یقین ہے جیسا کہ ہم نے اس سلسلہ میں اپنے رسالے "سلطنة المصطفیٰ فی ملکوت کلّ الوریٰ" میں تحقیق کی، اس میں کچھ ایسے مباحث جلیلہ اور پسندیدہ دلائل ہیں جن سے آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں، کان لطف اندوز ہوتے ہیں اور سینے کشادہ ہوتے ہیں۔ والحمد للہ رب العالمین۔

لہذا ابو بکر صدیق اور ان کے علاوہ جس کو بھی جو کچھ مال ودولت اور مقام ومرتبہ حاصل ہوا وہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عطا سے ہی ہے، تو حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احسانات ان دینی احسانات میں منحصر نہیں جن کا بدلہ نہیں دیا جا سکتا، تو جس طرح حضرت علی اس آیت کے مصداق نہیں ہو سکتے اسی طرح ابو بکر بھی یکساں طور پر اس آیت کے مصداق نہیں۔

میں کہتا ہوں: اس اعتراض کا جواب دو طرح ہے:

اول: یہ کہ اگر تمہاری بات مان لی جائے تو پھر آیت سرے سے معطل ہو جائے گی اور کبھی اس کا کوئی مصداق نہ مل سکے گا۔ کیونکہ صحابہ کرام میں کوئی ایسا نہیں جو اپنے ماں باپ سے پیدا نہ ہوا ہو، یا اس پر حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دینی اور دنیوی کسی طرح کا کوئی احسان نہ فرمایا ہو۔

دوم: یہ (جو اشکال کا حل ہے) کہ دنیا کے تمام احسان ایسے نہیں جن کا بدلہ دیا جا سکتا ہو، اس لیے کہ احسان کا بدلہ اس طرح ہوتا ہے کہ احسان کے برابر اس کی جزا دی جائے، اور والدین کے احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انہیں بچے کے عدم کی تاریکی سے وجود

کی روشنی میں آنے کا سبب بنایا، اور انہیں کے ذریعہ اس کو خوبصورت انسان بنایا حالاں کہ وہ بے وقعت پانی تھا۔ اس احسان کا بدلہ نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ وہ اپنے والدین کو زندہ کر دے، یا عدم کے بعد وجود بخش دے، اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: (”لَا یَجزِي وَلَد وَالِدَہٗ إِلَّا أن یَّجِدَہٗ مَملُو کاً، فَیَشتَرِیَہٗ فَیُعتِقَہٗ“) کوئی بچہ اپنے ماں باپ کا بدلہ نہیں چکا سکتا مگر یہ کہ اسے غلام پائے تو اسے خرید کر آزاد کر دے۔ یہ حدیث مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے اپنی سندوں سے روایت کی۔

اس حدیث میں حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے تھوڑے سے بدلے کی طرف اشارہ فرمایا جو انسان کی قدرت میں ہے، اس لیے کہ غلامی موت کی طرح ہے، کیوں کہ اس کی وجہ سے آدمی کی اہلیت معطل ہو جاتی ہے اور عاقل بالغ انسان جانوروں کے حکم میں شمار کیا جاتا ہے، لہذا اس کو آزاد کرنا گویا اسے زندہ کرنا ہے اور بہیمیت کی تاریکی سے نکال کر انسانیت کی روشنی میں لے آنا ہے۔ اسی لیے ماں باپ کو آزاد کرنا ان کے بعض حقوق کی ادائیگی میں شمار ہوا۔

اسی طرح نبوی احسانات جیسا کہ ہم نے واضح کیا ایسے نہیں جن کا بدلہ دیا جا سکے، اور یہ کہا جائے کہ یہ احسان اس احسان کا بدلہ ہے، اس لیے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اس مقام رفیع اور منصب بے نظیر میں بادشاہ مقتدر تبارک وتعالیٰ کی نیابت میں کام کرتے ہیں، اور اس بادشاہ جلیل کی نعمتوں کا بدلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ حسب تصریح قرآن عظیم احسان کا بدلہ احسان ہی سے ہو سکتا ہے (اور رب جلیل پر احسان کرنے اور اپنی ملک سے اسے کچھ عطا کرنے کی کوئی صورت نہیں) اس لیے کہ بندہ جس چیز سے بھی بدلہ چکانا چاہے گا یقیناً وہ حضور نائب رب جلیل صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عطاؤں میں سے ایک عطا ہو گی تو ان کی عطا کی مکافات خود انہی کی ایک عطا سے لازم آئے گی، ایسی عطا کا مکافات ہونا غیر متصور اور نامعقول ہے۔

یہیں سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا شکر بایں معنی محال ہے کہ ہم اپنے ذمہ سے بری ہو جائیں، اس لیے کہ شکر کرنا یہ بھی تو ایک نعمت ہے تو بندہ اب اس دوسری نعمت کا شکر ادا کرے تا کہ اس سے عہدہ برآ ہو، اور یہ سلسلۂ شکر یوں ہی جاری رہے گا اور نہایت کو نہ پہنچے گا۔ لہذا ثابت ہوا کہ دلیل پر اس وجہ سے کوئی غبار نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ مقدمہ جس کا مضمون یہ ہے کہ اس بات پر ساری امت کا اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ابوبکر صدیق ہیں یا علی۔ اس پر اعتراض کی گنجائش ہے، اس لیے کہ یہاں دو فرقے اور ہیں: ان میں ایک دعویٰ کرتا ہے کہ سیدنا فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ ساری امت سے افضل ہیں، اس کی دلیل وہ حدیث ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

("مَا طَلَعَتِ الشَّمسُ عَلىٰ رَجُلٍ خَيرٍ مِّن عُمَرَ")

سورج کسی ایسے شخص پر طلوع نہیں ہوا جو عمر سے بہتر ہو۔

دوسری حدیث("لَو كَانَ بَعدِي نَبِيٌّ لَكَانَ عُمَرَ بنَ الخَطَّابِ")

"اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتے"

اور تیسری حدیث("إِنَّ اللّٰهَ تَعالىٰ بَاهىٰ بِأهلِ عَرفَةَ عَامَّةً، وَبَاهىٰ بِعُمَرَ خَاصَّةً")

اللہ تبارک وتعالیٰ نے عرفات میں جمع ہونے والوں کے ذریعہ عام طور سے فخر فرمایا اور عمر کے ذریعہ خاص طور پر مباہات فرمائی۔

حالاں کہ ان روایات اور ان کی طرح دوسری روایات سے ان کا مدعا ثابت نہیں ہو سکتا۔ نہ روایت کے لحاظ سے اور نہ درایت کے اعتبار سے۔ جیسے تفضیلی گروہ حضرت علی کی افضلیت ثابت کرنے کے لیے ان باتوں سے استدلال کرتا ہے۔

ایک حدیث خیر البشر ((عليٌّ خيرُ البَشرِ ، مَن شَكَّ فِيهِ فَقَد كَفَر))

(مسند الفردوس: ٦٢/٣)

دوسری حدیث طیر ((اللهم ائتني بأحب خلقك إليك يأكل معي هذا الطير فجاء عليٌّ فأكل معه)) (سنن الترمذي : كتاب المناقب، ٤٠١/٥)

تیسری غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت علی کو اپنا نائب بنا کر مدینہ طیبہ میں چھوڑنا۔

(سنن الترمذي: ٤٠٧/٥)

یہ اور اس طرح کی جو بھی روایات ہیں وہ سب یا تو موضوع ہیں۔ یا منکر واہی۔ یا ان

کے مدعا میں مفید نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہر بد مذہب کے سلسلہ میں یونہی قائم ہے کہ وہ ایسی چیزوں سے استدلال کرتا ہے جو دلیل بننے کے لائق نہیں۔ اور ایسی جگہ کی خواہش کرتا ہے جہاں کے لیے کوئی راستہ نہیں۔

دوسرا گروہ سیدنا عباس بن عبدالمطلب کو افضل مانتا ہے۔ ان کی دلیل یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ((ان عم الرجل صنو أبیہ)) آدمی کا چچا اس کے باپ کے مثل ہے۔

یہ حدیث حسن ہے، امام ترمذی وغیرہ نے اس کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

مگر اس حدیث سے ان کا مقصود حاصل نہیں ہوتا۔

ابن عساکر نے تاریخ دمشق میں حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کیا کہ بروز قیامت سب لوگوں سے نیک بخت حضرت عباس ہیں۔

اس روایت کی سند کے بارے میں امام مناوی نے فرمایا ضعیف ہے۔

بلاشبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ شیخ المسلمین ہیں اور مسلمانوں کے سردار ہیں، ان کے صدر اور قائد، ان کی آبرو اور سروں کا تاج ہیں۔ اس اعتبار سے آپ کو خلفائے اربعہ پر بھی فضیلت ہے، جیسے فاطمہ زہرا اور ان کے بھائی سیدنا ابراہیم۔ علیٰ أبیھما وعلیھما الصلوٰۃ والسلام۔ اپنے نسب وجزئیت اور کرامت جوہر وطینت میں علی الاطلاق ساری امت سے افضل ہیں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ان چاروں صورتوں (افضل حضرت ابوبکر۔ یا علی۔ یا فاروق۔ یا عم مکرم رضی اللہ تعالیٰ عنہم) میں سے کوئی ایک شق اس وقت تک متعین نہیں ہوسکتی جب تک کہ باقی تین کو باطل نہ قرار دے دیا جائے، لہذا آپ نے یہ کیوں کہہ دیا کہ جب اس آیت کے مصداق علی نہیں تو ابوبکر صدیق متعین۔ علاوہ ازیں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ مسائل شرعیہ کا ثبوت دلیل شرعی سے ہی ہوگا۔ لہذا اصحاب نظر وفکر اور حق کا متلاشی ایسی جگہ ابتداء کوئی مذہب نہیں رکھتا، وہ پہلے دلیل میں غور وفکر کرتا ہے تاکہ کوئی راستہ اس کے لیے واضح ہو (پھر حسب

دلیل کوئی مذہب اختیار کرتا ہے) اگر تمامیت دلیل اس پر موقوف ہو کہ پہلے کوئی مذہب اختیار کرلیا جائے تو دور لازم آئے گا (اس لیے کہ کوئی مذہب اختیار کرنا تمامیت دلیل پر موقوف، اور تمامیت دلیل اختیار مذہب پر موقوف ٹھہری)۔ اب اگر دلیل کسی مذہب کے اصول پر تام اور مکمل ہو تو یہ دور کو مستلزم ہے۔ اور یہ اس جواب کی نظیر ہے جو ہم نے ائمہ شافعیہ کی اس دلیل کے جواب میں کہا جو انہوں نے وضو میں ترتیب کو فرض قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ﴿فـاغسلوا وجـوهكم﴾ میں ''فاء'' غسل وجوہ (چہروں کے دھونے) پر داخل ہے، اور کوئی قائل بالفصل نہیں۔ جیسا کہ خلافیات میں یہ مسئلہ مذکور ہے۔ (۱)

میں کہتا ہوں: اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس باب میں ہماری سب سے پہلی دلیل جس پر ہمارا اعتماد ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ وتابعین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا اس بات پر اجماع ہے کہ صدیق اکبر ہی اس آیت کا مصداق اور وہی افضل علی الاطلاق ہیں۔ امام شافعی، امام بیہقی اور دیگر حضرات نے یہ اجماع نقل کیا ہے اور امام بخاری وغیرہ کی روایت کردہ احادیث بھی اس پر دلالت کرتی ہیں۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''مطلع القمرین فی ابانة سبقة العمرین'' میں کی ہے، اور اس بات پر زبردست دلیل قائم کی ہے کہ اجماع تام اور کامل ہے، اس میں کوئی شذوذ نہیں۔ یعنی اس اجماع کے خلاف کسی امام مستند کا قول ثابت نہیں اور ابوعمر بن عبدالبر نے جس اختلاف کا تذکرہ کیا وہ روایۃً، درایۃً کسی طرح قابل التفات نہیں۔ اور اگر ہم بقول علامہ ابن عبدالبر یہ تسلیم بھی کرلیں کہ اس بارے میں پہلے کسی کا کچھ اختلاف تھا تو

---

(۱) ان کا استدلال یوں ہے کہ غسل وجوہ پر فا داخل ہے جو ترتیب کے لیے آتا ہے تو اراداۂ نماز پر غسل وجوہ کو مرتب کرنا فرض ہوا، اور جب غسل وجہ میں ترتیب اور اس کی تقدیم فرض تو باقی میں بھی فرض ورنہ خلاف اجماع لازم آئے گا، اس لیے کہ اس کا کوئی قائل نہیں کہ بعض اعضا میں ترتیب فرض ہو اور بعض میں فرض نہ ہو۔

جواب یہ ہے کہ ترتیب کو فرض قرار دینے والے اسی آیت کے فا سے استدلال کرتے ہیں، جب استدلال تام ہوگا تب ہی اسے موقف بنانا درست ہوگا، اور اس کے بعد مخالف پر خلاف اجماع کا الزام دیا جاسکے گا۔ اور یہاں ایسا نہیں بلکہ تمامیت دلیل مخالفت اجماع پر موقوف ہے اور مخالفت اجماع کا الزام تمامیت دلیل پر موقوف ہے (مترجم)

ہمیں سواد اعظم کے اتباع کا حکم ہے اور شاذ کی پیروی سے ممانعت ہے۔ مذہب اختیار کرنے کے لیے اتنا ہمیں کافی ہے (کہ یہ سواد اعظم کا مذہب رہا ہے) اور دور نہ رہا۔ (اس لیے کہ دلیل، اجماع سواد اعظم پہلے متحقق ہوئی اور ہمارا اسے مذہب قرار دینا بعد میں ہوا) تو وہ نہ روایت کے اعتبار سے قابل التفات، اور نہ درایت کے اعتبار سے۔ اور ہم مان بھی لیں تو پیروی سواد اعظم کی ہوگی، شاذ و نادر کی ممنوع ہے۔ ہمیں مذہب اختیار کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے، لہذا دور منتفی ہوگیا۔

ہاں ان دونوں فرقوں (افضلیت فاروق کے قائلین اور افضلیت سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے قائلین) کی بات قوی و درست ہے لیکن ہمارے مقصود میں خلل انداز نہیں، اس لیے کہ حضرت عمر فاروق اعظم اور حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہما آیت کے نزول کے وقت مسلمان ہی نہ ہوئے تھے، جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے، تو بلا شبہ یہ آیت میں مقصود نہیں ہو سکتے۔

ہماری اس تقریر سے باقی دو شقیں باطل ٹھہریں اور ہماری دلیل مضبوط و مستحکم رہی۔

والحمد لله ولي الاحسان۔

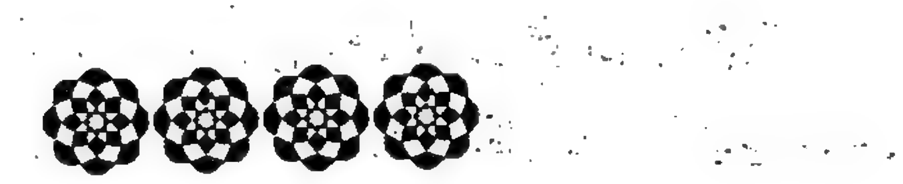
زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مستدل امام رازی ان دونوں اقوال پر یا تو مطلع نہیں تھے، یا پھر ساقط اور شاذ ہونے کی بنیاد پر ان کو لائق شمار ہی نہ جانا، ویسے ہم بحمد اللہ اجماع کے ثبوت کے بعد ان تکلفات سے بے نیاز ہیں، کما لا یخفیٰ۔

جب یہ ثابت ہو چکا تو ہم کہتے ہیں: اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے صدیق اکبر کا وصف بیان فرمایا کہ یہ اتقی ہیں، اور اتقی کے بارے میں فرمایا کہ وہ اکرم ہے، تو دونوں مقدموں سے نتیجہ نکلا کہ صدیق اکبر اللہ تعالیٰ کے یہاں اکرم ہیں۔

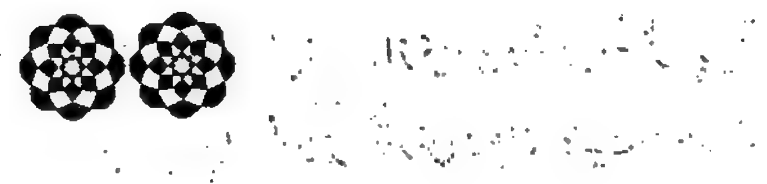
واضح رہے کہ افضل، اکرم، ارفع، اعلیٰ، یہ تمام الفاظ ایک معنی پر صادق آتے اور بولے جاتے ہیں، لہذا ثابت ہوا کہ فضل مطلق کلی صدیق اکبر کے لیے خاص ہے، اور اللہ تعالیٰ توفیق کا مالک ہے، ہم نے یہاں اپنے دعوی کے اثبات میں دلیل کی ایسی تقریر کی جس سے بیمار ذہن شفا پائیں، اور پیاسے سیراب ہوں، اور حمد ہے عظیم وجلیل مولیٰ کے لیے۔

خیال رہے کہ ہمارے اس استدلال پر جملہ علمائے سلف وخلف کا اتفاق ہے، سب نے اسے پسند کیا، علمائے متقدمین ومتاخرین سب نے تلقی بالقبول سے مزین فرمایا، اور بلاشبہ یہ اس کے لائق ہے۔

مگر یہاں تفضیلی گروہ کو تین وجوہ سے کلام ہے، ہم ان کے اعتراضات نقل کر کے جوابات دیں گے اور ایسے جواب کہ کوئی دقیقہ باقی نہ رہے۔ یہ سب خدائے بزرگ وبرتر کی توفیق سے ہی ہوگا۔







باب اول

شبہۂ اولیٰ:

سب سے مضبوط ان حضرات کا یہی اعتراض ہے کہ بعض مفسرین نے "اتقی" اسم تفضیل کی تفسیر "تقی" صفت مشبہ کے صیغہ سے کی، جیسا کہ تفسیر معالم التنزیل، تفسیر بیضاوی، اوران کے علاوہ دوسری تفاسیر میں منقول ہے، لہذا اس آیت کریمہ سے استدلال سرے سے ساقط ہے۔(۱)

اقول: ہم پہلے چند مقدمات بطور تمہید پیش کرتے ہیں، یہ آپ کو اس شک وشبہہ کے جواب میں معین ومددگار رہوں گے، اس کے بعد ہم جواب باصواب کے چہرہ سے حجاب اٹھائیں گے، یہ اللہ علیم ووہاب کی توفیق سے ہوگا۔ لہذا ہماری گفتگو بغور سنو:

مقدمۂ اولیٰ:

نقلی وعقلی دونوں طرح کے کثیر دلائل اس بات پر متفق ہیں کہ الفاظ کو ان کے ظاہری معنی سے پھیرنا منع ہے، بجز اس کے کہ کوئی ایسی حاجت شدیدہ درپیش ہو جو اس کے بغیر پوری ہی نہ ہوسکے۔ اور بے ضرورت ظاہری معنی سے پھیرنا تاویل نہیں بلکہ تبدیل وتحویل ہے، اگر اس طرح کے تصرفات کی اجازت بے ضرورت ہی دے دی جائے تو پھر نصوص شرعیہ سے امان اٹھ جائے۔ کما لا یخفی۔

یہ اتنی ظاہر اور روشن بات ہے کہ اس پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں حتی کہ علمانے

---

(۱) اس لیے کہ اب آیت کا مضمون یہ ہوگیا کہ جو تقی "پرہیزگار" ہے اسے اس آگ سے دور رکھا جائے گا، یہ معنی نہ ہوئے کہ وہ جو اتقی "سب سے زیادہ پرہیزگار" ہے اسے دور رکھا جائے گا۔ اب اس کے مصداق حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالی عنہ ہیں تو ان کا تقی ہونا ثابت ہوا، اتقی ہونا ثابت نہ ہوا، پھر دوسری آیت ﴿ان اکرمکم عند اللہ اتقکم﴾ اس پر مرتب ہی نہ ہوگی، اس لیے کوئی دلیل ہی نہ بن پائی۔ (مترجم)

اس کو متون عقائد میں تحریر فرمایا، اور واقعی یہ مسئلہ اس لائق تھا۔ اس لیے کہ تمام بد مذہبوں کی پوری کوشش یہی رہی ہے کہ عبارات شرعیہ کو ان کے ظاہری معنی سے پھیر دیا جائے اور فاسد تاویلات، بے دلیل احتمالات اور نا مقبول عذر کا سہارا لیا جائے، لہٰذا ہم پر لازم ہے کہ مقام ضرورت کے سوا ہر جگہ نصوص شرعیہ کو ان کے ظاہری معنی پر محمول کریں، یہ بہت صاف اور واضح بات ہے۔

مقدمہ ثانیہ:

ایسا نہیں کہ اکثر تفاسیر متداولہ میں جو کچھ ذکر ہو گیا ہے سب واجب القبول ہو، اگرچہ دلیل نقلی کی موافقت اور دلیل عقلی کی تائید سے خالی ہی ہو۔ (موجودہ اور متداولہ تفسیروں میں بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کو قبول کرنا اور معتبر جاننا ہم پر لازم نہیں، اس لیے کہ ان کے مندرجات عقل یا نقل، یا عقل و نقل دونوں کے خلاف ہیں)۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ تفسیر مرفوع یعنی جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہو، اور اس کو قبول کرنا ضروری ہو، ایسی تفسیر نہایت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے کہ کل ملا کر دو جز بلکہ ایک جز تک پہنچنا بھی مشکل ہے۔

امام جوینی فرماتے ہیں: علم تفسیر مشکل اور قلیل ہے، اس کا مشکل ہونا تو چند وجوہ سے ظاہر ہے۔ سب سے زیادہ ظاہر وجہ یہ ہے کہ یہ ایسے متکلم کا کلام ہے جس کی مراد تک لوگوں کی رسائی خود اس سے سن کر نہ ہوئی، اور نہ ان کی وہاں تک رسائی ممکن۔ اشعار، مثلوں اور اس طرح کی چیزوں کا معاملہ اس کے برخلاف ہے اس لیے کہ یہ سب انسانی کلام ہیں جن کی مراد خود قائل سے۔ یا۔ اس سے سننے والے کے ذریعہ معلوم ہو سکتی ہے، مگر قرآن کی تفسیر کا قطعی علم نہیں ہو سکتا سوائے اس صورت کے کہ وہ تفسیر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے مسموع ہو، اور ایسی مسموع مرفوع تفسیر سوائے چند آیات کے دیگر میں ناممکن اور متعذر رہے۔

مگر قرآن کریم کی تفسیر قطعی کا علم تو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سن کر ہی ہو سکتا ہے۔ اور اس کا ثبوت نہایت دشوار، بس چند آیات میں اس طریقہ کا ثبوت ہو سکتا ہے، اس لیے باقی قرآن کی مراد کا علم امارات و دلائل کے ذریعہ ہی استخراج کیا جاتا ہے، اس میں اللہ

تعالیٰ کی حکمت یہ ہے کہ اس نے چاہا کہ بندے اس کی کتاب میں غور وفکر کریں، اسی لیے اس نے اپنے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اس بات کا حکم نہیں دیا کہ وہ ہر آیت کی مراد صراحۃً بیان کریں۔

امام زرکشی ''البرھان فی علوم القرآن'' میں فرماتے ہیں: قرآن کی تفسیر معلوم کرنے کے لیے غور وفکر کرنے والے شخص کے لیے بہت سے طریقے ہیں، ان میں سے خاص طور پر چار بنیادی ہیں۔

پہلا طریقہ یہ ہے کہ وہ تفسیر حاصل کرے جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے منقول ہو، اور یہی سب سے ممتاز طریقہ ہے۔ لیکن یہاں ایک بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ منقولہ احادیث میں بہت ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔

امام سیوطی نے فرمایا: منقول تفسیر میں صحیح بہت کم ہے، بلکہ مرفوع روایات تو نہایت قلیل ہیں۔ یہی حال ان روایات کا ہے جو صحابہ کرام اور تابعین عظام سے مروی ہیں کہ وہ بھی قلیل ہیں اور ان بڑے بڑے دفتروں، طوماروں اور اقوال سے متعلق جو یہاں وہاں پراگندہ ومنتشر ہیں، نہ کوئی حدیث ہے، اور نہ کسی صحابی یا تابعی کا قول۔ یہ تفاسیر اور اقوال تو صحابہ وتابعین کے بعد ظاہر ہوئے جب آرا کی کثرت اور خیالات ومذاہب میں تصادم ہوا تو ہر لغوی، نحوی، بیانی، اور علوم قرآن کی کسی بھی نوع کا جاننے والا قرآن کریم کی تفسیر میں مشغول ہوا اور جہاں تک اس کی نظر وفکر نے کام کیا تفسیر قرآن میں اس نے حصہ لیا۔ اس کے بعد وہ زمانہ آیا کہ لوگ جمع اقوال کا شوق لیے رواں دواں آئے اور جو ملا سب کو نقل کر ڈالا، اسی وجہ سے اقوال کی کثرت اور حق وناحق کی ملاوٹ رونما ہوئی۔

ابن تیمیہ نے ذکر کیا: جب کہ امام سیوطی نے اس کا کلام یہ کہہ کر نقل فرمایا کہ نہایت نفیس ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں:

وجہ اول: بعض لوگوں نے کچھ معانی کو پہلے اپنا عقیدہ ٹھہرایا، پھر اپنے معانی اور عقائد کو ثابت کرنے کے لیے الفاظ قرآن کو ان پر محمول کیا۔

وجہ دوم: کچھ اور لوگوں نے قرآن کی تفسیر محض اس بنیاد پر کر دی کہ یہ تفسیر بھی عربی

زبان بولنے والوں، اور ایسے الفاظ کو اپنی زبان ومحاورات میں استعمال کرنے والوں کی مراد ہو سکتی ہے۔

ان لوگوں نے نہ تو متکلم قرآن باری تعالیٰ کی عظمت شان کو ملحوظ رکھا اور نہ ان کا جن پر نازل ہوا اور جو مخاطب تھے، لہذا پہلے گروہ نے قرآن کو اپنے عقیدہ کے تابع بنایا، انہوں نے اس معنی کی رعایت نہ کی جس کے الفاظ قرآن مستحق تھے، دوسرے گروہ نے محض الفاظ اور عربی زبان کا اعتبار کیا، انہوں نے متکلم لایزال کی شان اقدس اور اس کے کلام مقدس کے سیاق وسباق کا کوئی لحاظ پاس نہ رکھا۔

پھر یہ قسم دوم کے لوگ بکثرت یہی سمجھنے میں غلطی کرجاتے ہیں کہ از روئے لغت، لفظ ان معانی کا احتمال رکھتا ہے یا نہیں، جیسے اس بارے میں قسم اول کے لوگوں سے بھی غلطی ہوتی ہے۔

اسی طرح قسم اول کے لوگوں سے بکثرت یہ غلطی ہوتی ہے کہ جن معانی سے وہ قرآن کی تفسیر کرتے ہیں وہ معانی ہی درست نہیں ہوتے، جیسے قسم دوم کے لوگوں سے بھی ایسی غلطی ہوتی ہے، اگرچہ قسم اول کے لوگوں کی نظر اولاً معنی کی طرف ہوتی ہے، اور قسم دوم کے لوگوں کی نظر اولاً الفاظ کی طرف ہوتی ہے۔

پہلا گروہ دو طرح کا کام کرنے والوں پر مشتمل ہے:

(۱) قرآن کا جو مدلول ہے اور قرآن کی جو مراد ہے اسے لفظ قرآن سے سلب کرلیتے ہیں اور اس کے علاوہ کچھ اور معنی ومطلب بتاتے ہیں۔

(۲) قرآن کا جو نہ مدلول ہے نہ اس کی مراد ہے اس پر لفظ قرآن کو محمول کرتے ہیں۔

دونوں صورتوں میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ معنی باطل ہوتے ہیں جنھیں انھوں نے ثابت کرنا یا رد کرنا چاہا، تو دلیل اور مدلول دونوں میں ان سے خطا ہوتی ہے اور کبھی وہ معنی حق ہوتے ہیں تو ان سے صرف دلیل میں خطا ہوتی ہے، مدلول میں نہیں۔

پھر اس کے آگے ابن تیمیہ نے کہا: خلاصہ یہ ہے کہ جو صحابہ وتابعین کے مذہب اور ان کی تفسیر سے انحراف کرکے ان کی مخالفت کرے گا وہ خطاکار بلکہ بدمذہب ٹھہرے گا، اس

لیے کہ صحابہ وتابعین کو قرآن کی تفسیر اور اس کے مطالب کا علم زیادہ تھا۔ جس طرح انہیں اس دین حق کا علم زیادہ تھا جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو دنیا میں بھیجا، انتہی ملخصاً۔

اسی لیے امام ابو طالب نے اپنی تفسیر کے اوائل میں آداب مفسر کے تحت فرمایا: مفسر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان باتوں پر اعتماد کرے جو تفسیر کے سلسلہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وتابعین عظام سے منقول ہیں، اور نئی باتوں سے پرہیز کرے، اس سلسلہ میں ابن تیمیہ نے مزید کہا: صحابہ کرام کے درمیان قرآن کی تفسیر میں بہت کم اختلاف تھا، ان کے بعد تابعین میں اگرچہ اختلافات میں کچھ اضافہ ہوا لیکن بعد والوں کی بہ نسبت پھر بھی کم تھا۔

امام سیوطی نے قدما کی تفسیروں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا: پھر تفسیر میں بہت لوگوں نے کتابیں تصنیف کیں، ان میں سندوں کو مختصر کر دیا گیا اور اقوال بھی ناتمام ذکر کیے، اس طرح ان کے اپنے خیالات بھی اس میں داخل ہو گئے اور صحیح روایات سے خلط ملط ہو گئے۔ پھر جس کے دل میں جو بات آئی وہ لکھتا چلا گیا، اور اس کی فکر کی جہاں تک رسائی ہوئی اس پر اعتماد کر لیا، بعد میں آنے والے مفسر نے ان کی باتوں کو یہ سمجھ کر نقل کرنا شروع کر دیا کہ ان کی کوئی اصل ضرور ہوگی۔

اس نے یہ زحمت نہیں کی کہ سلف صالحین اور تفسیر میں مرجع ومستند کی حیثیت رکھنے والے حضرات سے جو منقول ہے اس کی تنقیح وتحریر پر توجہ دے، یہاں تک کہ میں نے دیکھا کہ ﴿غَيرِ المَغضُوبِ عَلَيهِم وَلَا الضَّالِّينَ﴾ کی تفسیر میں بعض حضرات نے دس اقوال تک نقل کر ڈالے حالاں کہ ﴿مَغضُوبِ عَلَيهِم﴾ اور ﴿الضَّالِّين﴾ سے یہود ونصاری مراد ہیں، یہی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور جمیع صحابہ وتابعین اور تبع تابعین سے منقول ہے، یہاں تک کہ ابن ابی حاتم نے کہا: میں اس سلسلہ میں مفسرین کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا، انتہی۔

اس کے بعد امام سیوطی فرماتے ہیں: اگر تم کہو کہ پھر کون سی تفسیر پر اعتماد کرنے کی آپ ہمیں رہنمائی کرتے ہیں، اور مطالعہ کرنے والوں کو کس پر بھروسہ کا مشورہ دیتے ہیں، جواب

میں فرمایا: تفسیر امام ابو جعفر ابن جریر طبری مدنی۔ معتمد علمائے کرام کا اس بات پر اجماع ہے کہ اس جیسی تفسیر نہیں لکھی گئی۔

امام احمد بن حنبل سے مقاصد، برہان، اور اتقان وغیرہ میں روایت ہے کہ تین طرح کی کتابیں مستند نہیں۔

(۱) کتب سیر و مغازی۔ (۲) کتب تواریخ۔ (۳) کتب تفسیر (انتہی)

میں کہتا ہوں: یہ قول اگر چہ علی الاطلاق جاری نہیں اس لیے کہ واقعہ شاہد ہے کہ ان میں بہت سی باتیں مستند بھی ہیں مگر امام احمد نے یہ بات اسی وقت فرمائی جب یہ دیکھا کہ ان تینوں میں خلط غالب ہو گیا ہے، کما لا یخفی، یہ تو ان کے زمانہ کی بات ہے، پھر بعد کا کیا حال ہوا ہوگا۔

مجمع بحار الانوار میں رسالہ ابن تیمیہ سے منقول ہے: تفسیر میں موضوع روایات بہت ہیں، جیسے ثعلبی، واحدی، اور زمخشری سورتوں کے فضائل میں اس طرح کی روایات لاتے ہیں۔ امام ثعلبی اپنی ذاتی شخصیت میں صاحب خیر و دیانت تھے، لیکن حاطب اللیل تھے (رات کو لکڑیاں چننے والے کی طرح تھے) کہ کتب تفسیر میں صحیح، ضعیف اور موضوع جو روایات بھی ملیں نقل کر دیں۔ ان کے رفیق فن واحدی اگر چہ عربی زبان میں ان سے زیادہ بصیرت رکھتے تھے لیکن سلف صالحین کی اتباع سے بہت دور تھے، امام بغوی کی تفسیر ''معالم التنزیل'' اگر چہ ثعلبی کی تفسیر کا اختصار ہے لیکن موضوع اور نو ایجاد تفسیروں سے پاک ہے۔ انتہی

لیکن اسی مجمع البحار میں معین بن صفی کی تفسیر جامع البیان سے منقول ہے: کبھی امام محی السنہ بغوی اپنی تفسیر میں وہ معانی اور حکایات ذکر کر دیتے ہیں جن کے ضعیف بلکہ موضوع ہونے پر متاخرین متفق ہیں۔ انتہی۔

نیز اسی میں امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا: کلبی کی تفسیر شروع سے آخر تک جھوٹ ہے، اس کا مطالعہ جائز نہیں۔ انتہی

خلیل بن عبد اللہ خلیلی قزوینی نے اپنی کتاب ''ارشاد'' میں تفسیر کے تھوڑے اجزا ایسے شمار کیے ہیں جن کی سندیں صحیح ہیں، ان کا اکثر بلکہ کل اب ناپید ہے، ہاں مگر اس کی کچھ نقلیں

متاخرین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں۔ پھر فرمایا: اور یہ لمبی لمبی تفسیریں جن کی نسبت حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی جانب کی جاتی ہے، یہ سب ناپسندیدہ ہیں، ان کے راوی مجہول ہیں۔ جیسے جویبر کی تفسیر جو حضرت ضحاک کے واسطہ سے حضرت ابن عباس سے منقول ہے۔ الخ۔

پھر اس کے بعد کہا: ابن جُریج کی تفسیر کا حال یہ ہے کہ انہوں نے صحت کا التزام نہ کیا، بلکہ ہر آیت کے سلسلہ میں ان کو جو بھی صحیح اور ضعیف ملا روایت کر دیا، اور مقاتل بن سلیمان کی تفسیر کا حال یہ ہے کہ خود مقاتل کو علمائے کرام نے ضعیف قرار دیا لیکن بہت سے اکابر تابعین سے ان کی ملاقات ہے۔ اور امام شافعی نے اشارہ دیا کہ ان کی تفسیر لائق اعتماد ہے۔ انتھی

امام سیوطی قدس سرہ فرماتے ہیں: تفسیر ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی سب سے کمزور سند "كلبي عن أبي صالح عن ابن عباس" ہے، پھر اگر اس میں "محمد بن مروان سدی صغیر" کی روایت مل جائے تو پھر یہ سلسلۂ کذب ہے حالاں کہ بسا اوقات ثعالبی اور واحدی اس سند سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن امام ابن عدی نے کامل میں فرمایا: کلبی کی کچھ روایات لائق اعتماد ہیں اور خاص طور پر وہ جو "ابو صالح" کے واسطہ سے ہیں، اور کلبی فن تفسیر میں معروف ومشہور ہیں، کسی کی تفسیر ان سے زیادہ طویل اور بھرپور نہیں۔ ان کے بعد مقاتل بن سلیمان ہیں۔ مگر کلبی کو ان پر فضیلت حاصل ہے اس لیے کہ مقاتل کے یہاں ردی خیالات ہیں، اور سند "ضحاك بن مزاحم عن ابن عباس" منقطع ہے، اس لیے کہ ضحاک کی حضرت ابن عباس سے ملاقات نہیں، پھر اگر ان کے ساتھ "بشر بن عمارة عن ابی روق" کی سند شامل ہو جائے تو یہ سند ضعیف ہے۔ اس لیے کہ بشر ضعیف ہیں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے اس طریق سے بہت سی روایات لی ہیں۔ اور اگر سند میں "جویبر" آجائے تو پھر سند شدید ضعیف ہے، اس لیے کہ جویبر شدید ضعیف اور متروک ہیں۔

امام سیوطی نے مزید فرمایا: میں نے ابو عبداللہ محمد بن احمد بن شاکر قطان کی کتاب "فضائل امام شافعی" میں دیکھا، انہوں نے اپنی سند سے بطریق ابن عبدالحکم ایک روایت بیان کی کہ میں نے امام شافعی کو فرماتے سنا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے تفسیر میں صرف سو احادیث کے قریب ثابت ہیں۔ انتھی

میں کہتا ہوں: یہ معالم التنزیل جو امام بغوی کی تفسیر ہے دوسری متداول تفسیروں کے مقابلہ میں غلطیوں سے محفوظ ہے اور طریقہ حدیث کے قریب ہے پھر بھی ڈھیروں ضعیف، شاذ اور واہی منکر روایتوں پر مشتمل ہے اور بسا اوقات اس کی سندیں ان مفسرین کے گرد گھومتی ہیں جو ضعیف و مجروح قرار دیے گئے ہیں، جیسے ثعالبی، واحدی، کلبی، سدی، مقاتل وغیرہم جن میں سے بعض کا ذکر ہم نے کیا اور بعض کا نہیں۔ پھر ان کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جن کو نہ علم حدیث سے اعتنا، اور نہ ان میں کھرے کھوٹے کو جانچنے کی قدرت۔ جیسے قاضی بیضاوی اور ان کے علاوہ وہ جو ان کے طریقہ پر گامزن ہوئے۔ لہذا ان کے ایسے اقوال کے بارے میں مت پوچھو جن کی نہ کوئی لگام ہے نہ نکیل (یعنی محض بے سند اقوال لکھ دیئے ہیں جن کے قائلوں کا کچھ اتا پتا نہیں)۔

یہ بھی چھوڑو! کاش یہ لوگ اسی پر اقتصار کرتے مگر حال یہ ہے کہ کچھ لوگ اس سے بھی آگے بڑھے۔ اور ایسی راہ اختیار کی جو ہلاکتوں کی طرف کھینچ لاتی ہے، وہ یہ کہ انھوں نے قرآن کریم کی تفسیر میں ایسی باتیں لکھ دیں جن سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، دل ان سے نفرت کرتے ہیں، اور کان انھیں سننا گوارا نہیں کرتے، اس لیے کہ انبیائے کرام اور ملائکہ عظام کے قصوں میں ایسی باتوں کو بیان کر ڈالا ہے جو ان کی عصمت کے خلاف ہیں، یا جن کے سبب جاہلوں کے دلوں سے ان کی عظمت جاتی رہتی ہے۔ یہ باتیں ان لوگوں پر واضح ہیں جنھوں نے حضرت آدم وحوا کا قصہ، حضرت داؤد و اوریا کی حکایت، حضرت سلیمان اور ان کی کرسی پر پڑے ہوئے جسم کا معاملہ، حضور اقدس علیہ الصلاۃ والسلام کی تلاوت قرآن میں شیطان کے القا سے لفظ ''غرانیق علی'' کا اضافہ ، اسی طرح ہاروت و ماروت اور بابل کا ماجرا، ان تفسیروں میں پڑھا ہو۔ ان تمام چیزوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور اسی سے فریاد ہے۔

ان بے سروپا حکایات وقصص کے ذکر سے ان پر بھی وہی مصیبت اور خرابی آئی جو سیر ومغازی اور تاریخ کے مصنفین پر اختلافات صحابہ نقل کرنے سے آئی، اس لیے کہ ان میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو دین کے مخالف اور ایمان کو کمزور کرنے والی ہیں، پھر فساد پر فساد اور خطاؤں پر خطائیں یوں بڑھ گئیں کہ ان لوگوں کی بے بنیاد باتوں کی خبر ان کو بھی ہو گئی جن کے

پاس نہ کچھ بچا کھچا علم تھا اور نہ عقل کی پختگی۔ تو وہ خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ یا تو ان کے کلمات سے دھوکا کھایا اور اس سے بے خبر رہے کہ اس میں کیسا شدید وبال اور سخت عذاب ہے۔ یا ظلم اور سرکشی کی بنیاد پر انھیں اسے ظاہر کرنے کی جرأت ہوئی اس لیے کہ ان کے دلوں میں انبیائے کرام کی تنقیص اور اولیائے عظام کی تفسیق پوشیدہ تھی، اس روش پر بڑے قائم رہے، اور بعد میں آنے والے چھوٹوں نے اسی ماحول میں پرورش پائی تو بہت سے کچے لوگوں کا دین بگڑ گیا، اس لیے یہ لوگ ان عوام سے بدتر ہو گئے جو اس طرح کی کتابوں کا مطالعہ نہ کر سکے، اور ان کے فتنوں سے محفوظ رہے۔

ان تمام چیزوں کے پیش نظر ہمارے علمائے کرام نے ان دونوں گروہوں کی خیر خواہی میں اپنی کوششیں صرف فرمائیں اور دونوں فریق پر سخت تنقید کی، یعنی غیر مستند تفاسیر اور سیرت کی ناپسندیدہ کتابوں پر، ان حضرات نے ان کا بے بنیاد ہونا ظاہر فرمایا اور ان کے عیوب کو آشکارا کیا۔ جیسے امام قاضی عیاض نے شفا میں، ملا علی قاری نے شرح شفا میں، علامہ خفاجی نے نسیم الریاض میں، امام قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں۔ علامہ زرقانی نے شرح میں، شیخ محقق دہلوی نے مدارج النبوہ میں، اور ان کے علاوہ دوسرے علمائے کرام نے اپنی اپنی تصانیف میں۔ رحمة الله تعالىٰ عليهم اجمعين . والحمد لله رب العالمين .

ابو حیان صاحب تفسیر "البحر المحیط" نے اس سلسلہ میں ذرا نرم بات کہی اس لیے کہ امام سیوطی کی نقل کے مطابق ان کے الفاظ یہ ہیں کہ "مفسرین نے اسباب نزول اور سورتوں کے فضائل میں بہت سی ایسی روایات ذکر کر دیں جو صحیح نہیں، ساتھ ہی نامناسب حکایات اور اسرائیلی تواریخ و روایات بھی ذکر کرتے چلے گئے جن کا علم تفسیر میں ذکر کرنا مناسب نہ تھا" [یہ ان مفسرین پر بہت نرم انداز کی تنقید ہے]

واضح رہے کہ اس میدان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کے دلوں میں فلسفیانہ وسوسے آتے ہیں، اس لیے کہ انہوں نے اپنی عمریں اسی میں فنا کر دیں اور اسے مرغوب چیز سمجھا، لہذا ان کو دور از کار احتمالات بیان کرنے کی لت لگی ہے، اگر چہ ان میں نہ چاشنی ہے اور نہ رونق۔ حتی کہ بعض نے اللہ تعالیٰ کے فرمان (وانشق القمر) کی تفسیر میں وہ بات ذکر کی جس

سے جاہل نصاریٰ اور ان دوسرے لوگوں نے استناد کیا جن کے ایمان میں کھٹک ہے کہ وہ کلمہ اسلام کا اظہار تو کرتے ہیں مگر ان کے دلوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بغض وعناد اور انکارِ معجزات کے بڑے بڑے پہاڑ پوشیدہ ہیں۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔

یہی وجہ تھی کہ امام سیوطی نے عاجز آکر تمام تفسیروں سے بیزاری کا اظہار فرمایا اور صرف تفسیر ابن جریر کی طرف رہنمائی پر اکتفا کیا، جیسا کہ اس کی تفصیل گذری۔ اسی طرح امام ذہبی سیرت اور تاریخ کی کتابوں کی بے راہ روی سے پریشان ہوئے تو انہوں نے سب کو چھوڑ کر امام بیہقی کی دلائل النبوۃ پر اطمینان کا اظہار فرمایا اور کہا یہ سراسر نور ہے۔

یہ شدید فتنہ اور ہمہ گیر بلا بہت سے متاخرین متکلمین کی طرف بھی سرایت کر گئی جن کی زیادہ توجہ خبیث فلسفہ پر تھی، اور فن حدیث میں بصیرت حاصل نہ کی، حتی کہ بعض لوگ دلائل تو علاحدہ رہے مسائل میں ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جو بالکل سنت کے خلاف ہیں۔ اب جو ان کے درمیان قیل وقال، کثرت سوال اور شبہات وجدال ہیں ان سے تو بس دور ہی رہو اور ان کی حالت نہ پوچھو۔ آہ، اللہ تعالیٰ ہی سے فریاد ہے۔ اب تو معاملہ اس منزل کو پہنچ گیا ہے کہ ان کتابوں کو پڑھنے والا یہ نہیں پہچان پاتا کہ ان میں جو باتیں ہیں انھیں ارسطو اور افلاطون فلسفی لائے۔ یا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم لائے۔

بلاشبہ ان کے یہ کرتوت با حمیت اور غیرت مند علما پر شاق گذرے یہاں تک امام عالم باعمل سیدی شیخ محقق محدث دہلوی نے مسئلہ معراج میں جب ان کی یہ روش دیکھی تو برداشت نہ کر سکے اور ان کی بابت سخت کلام فرمایا، یہاں تک کہ ان کو گمراہ اور گمراہ گر کا نام دیا، اور آپ اس میں پہل فرمانے والے نہیں بلکہ ان سے پہلے ان پر قیامت کبریٰ اُن ائمہ کرام نے قائم فرمائی جو مرجع خلائق تھے، اور جن سے ایمان کے ستون قائم ہیں۔ یہ تمام تفصیلات ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر میں تحریر فرمائیں، چاہو تو اس کا مطالعہ کرو، اور جب تم مطالعہ کروگے تو تمہیں نہایت تعجب خیز چیزیں نظر آئیں گی۔

اسی بے راہ روی کی قبیل سے وہ باتیں ہیں جو بعض لوگوں نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے آپسی اختلافات کے بارے میں ذکر کیں اور بہت سے صحابہ بلکہ بعض عشرۂ مبشرہ کو

فاسق کہنے کی روایات بھی بہت سے علمائے اہل سنت وجماعت کی طرف منسوب کر دیں، حالانکہ خدا کی قسم انہوں نے قطعاً یہ بات نہ کہی اور نہ جائز سمجھی۔ لہذا حق بات یہ ہے کہ دین کا نظام حدیث کی روشنی میں قائم ہے، اور حدیث سے فقہائے کرام کے سوا سب کو گمراہی کا اندیشہ ہے، اور فقہ بھی شک وشبہ کی اتباع سے اور نادان عقل کو حاکم بنا کر حاصل نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمام مسلمانوں کو جہالت کے شر سے بچائے اور علم کے شر سے بھی محفوظ رکھے۔ اس لیے کہ علم کا شر زیادہ سخت اور نہایت تلخ ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلي العظیم۔

ہم نے یہاں تفصیلی گفتگو سنت کی حفاظت کے پیش نظر کی ہے، اور اس لیے کہ ہمیں یہ پسند نہیں کہ مسلمانوں کے درمیان فتنے رواج پائیں یا دین میں داخل ہو جائیں تو ایمان کو بگاڑ دیں، سن لو! اس پر مضبوطی سے قائم رہنا۔ اور یہ بھی یاد رکھو کہ نصیحت قبول کرنے والا گمراہ نہیں ہوتا، ہماری اس نصیحت کی مخالفت سے دور رہنا چاہیے تمہیں فتوی دینے والے کیسا ہی فتویٰ دیں۔

ضروری تنبیہ: میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی پناہ میں دیتا ہوں اس بات سے کہ کہیں ہماری نصیحت سے تم کسی وہم میں مبتلا ہو کر ہم پر افترا کرنے لگو۔ یا کم عقلی کی وجہ سے اس وسوسہ کے شکار ہو جاؤ کہ ہم تفسیروں کی پروا نہیں کرتے، ان کا ہمیں کوئی خیال نہیں، اور ہم ان کی اچھی بات بھی نہیں مانتے۔

واضح رہے کہ ہمارا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ تفسیر کی اکثر کتب متداولہ غیر مستند روایات واقوال سے محفوظ نہیں، ان میں صحیح اور غلط ہر طرح کے اقوال جمع کر دیے گئے ہیں، تو ایسے اقوال کی صرف حکایت کر دینے سے ہم پر ان کا ماننا لازم نہیں اور یہ عمل ناقد کے لیے ضعیف وسقیم کی تنقید سے مانع نہیں، (کسی کتاب کی روایات یا اقوال کو پرکھنا اور سقیم وغلط کو رد کرنا یہ معنیٰ نہیں رکھتا کہ وہ کتاب پوری کی پوری نامقبول یا ناقد کے نزدیک بالکل بے وزن اور ساقط ہے۔) یہ تفسیری کتابیں ہمارے نزدیک اکثر کتب حدیث سے بدتر حالت میں نہیں۔ ہم کبھی ان کتابوں کی مروی حدیثوں کو ترک کرتے ہیں اور کبھی ان کی حدیثوں سے استناد واستدلال کرتے ہیں، اس لیے کہ ہمیں معلوم ہے کہ یہ کتابیں ہر پنگھٹ پر اترتی ہیں، کبھی میٹھا بہت شیریں پانی لاتی ہیں، اور کبھی نمکین بہت کھارا پانی اٹھالاتی ہیں۔ مختصر یہ کہ مدار کار سند

ومتن کے لحاظ سے حدیث کی نظافت پر ہوتا ہے، جہاں ہمیں پکی عمدہ کھجوریں ملتی ہیں ہم چن لیتے ہیں اگر چہ وہ حنظل کی جگہوں میں ہوں، اور جہاں ہمیں حنظل نظر آتا ہے اس سے پرہیز کرتے ہیں اگر چہ وہ شہد بہنے کی جگہ اُگا ہو (یعنی سند اور متن کے لحاظ سے عمدہ اور لائق قبول حدیثیں جہاں بھی ملیں ہم ان سے استناد کریں گے اگر چہ کسی ادنی قرار دی جانے والی کتاب میں ہوں، اور جو کسی اعتبار سے قابل رد ہوں انھیں رد کریں گے اگر چہ کسی اعلیٰ درجہ کی کتاب میں ہوں)

تمھیں معلوم ہو چکا ہے کہ کتب تفاسیر میں غیر معتبر روایات کا اکثر حصہ ان کی سندیں معلوم نہ ہونے کی وجہ سے آیا، جب ان کی سندیں مجہول ہوں گی تو آخر کار ان کی تحقیق وتنقید لازمی چیز ہے، ان چیزوں کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے گا کہ جو احادیث نصوص شریعت کے خلاف اور منصوص احکام کو رد کر رہی ہیں۔ یا ان میں انبیاء ومرسلین کی تنقیص شان ہے۔ یا ان کے علاوہ کوئی دوسری بات جو قابل قبول نہ ہو، پائی جاتی ہے تو ہم ایسے اقوال کو محو کرنے کے لائق شمار کریں گے۔

اور اگر خرابیوں سے بری اور علتوں سے پاک ہے تو اس کو قبول کرلیں گے۔ لیکن یاد رہے کہ ہر جگہ قبول کرنا یکساں نہیں ہوتا بلکہ بڑا فرق ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ تفسیر بالرائے کی طرح ہوا حالانکہ تفسیر بالرائے سے ہمیں روکا گیا ہے، یہ تفسیر بالرای کے باب سے نہیں۔ خدا کی پناہ اس سے کہ ہم ایسا جسارت کریں، بلاشبہ علم تفسیر نہایت دشوار علم ہے، اس میں ان علوم کی ضرورت ہوتی ہے جو نہ عام طور پر حاصل اور نہ ان کا حاصل کرنا آسان، امام سیوطی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی کچھ تفصیلات بیان فرمائی ہیں۔

اسی طرح ہمارے سامنے جب تفسیر قرآن کے وہ مقامات آئیں جہاں ظاہری معنی سے عدول ہے اور صحیح سند سے ثابت ہو جائے کہ یہ ان کا قول ہے جن کی مخالفت کی گنجائش نہیں۔ یا وہاں پر کوئی ایسی حاجت ہے کہ اس کے بغیر پوری نہیں ہوتی، تو اب قبول کرنا متعین ہے۔ ورنہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام اقدس کی دلالت، اِن کے اُن کے اقوال سے زیادہ قابل

اعتماد ہے۔ یہی مقصود ہے۔ لہذا اس میں کمی وبیشی سے باز رہو۔

امام سیوطی فرماتے ہیں:

بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تقاضائے زبان ولغت کے اعتبار سے تفسیر قرآن کے بارے میں دو روایتیں ہیں، اس پر بعض علما نے فرمایا: کراہت اس وقت ہے جب کہ کسی آیت کو اس کے ظاہری معنی سے پھیر کر ایسے خارجی محتمل معانی پر محمول کرے جن پر دلالت اکثر عرب کے محاورات میں نہیں ملتی، مگر قلیل کلام میں یہ دلالت پائی جاتی ہے، جو زیادہ تر اشعار وغیرہ میں ملتی ہے اور متبادر اس کے برخلاف ہوتا ہے۔

امام زرکشی کی تصنیف "البر ها ن في علو م القر آ ن" سے امام سیوطی نے نقل فرمایا:

ہر وہ لفظ جو دو۔ یا دو سے زائد معنی کا احتمال رکھے اس میں علمائے کرام کے علاوہ کسی کو اجتہاد کی اجازت نہیں۔ اور یہ حضرات بھی شواہد ودلائل پر بھروسا کریں محض اپنی رائے سے نہ کہیں۔ پھر اگر ایک معنی زیادہ ظاہر ہوں تو انہی پر محمول کیا جائے، ہاں اگر کوئی دلیل اس بات پر قائم ہو جائے کہ یہاں وہی معنی مراد ہیں جو خفی اور غیر ظاہر ہیں، تو پھر اسی پر عمل ہوگا۔

پھر فرمایا: علمائے کرام فرماتے ہیں: مفسر پر واجب ہے کہ اس بات کا بھرپور لحاظ رکھے کہ تفسیر اس لفظ کے مطابق ہو جس کی تفسیر کی جارہی ہے، اور معنی کی وضاحت میں جن چیزوں کی ضرورت ہے ان میں کمی کرنے سے بچے۔ اسی طرح بے مقصد بات کو زیادہ کرنے سے بھی پرہیز کرے، اور اس بات کی بھی احتیاط رکھے کہ تفسیر میں معنی سے انحراف اور اس کے طریقہ سے عدول نہ ہو۔ اس پر لازم ہے کہ معنی حقیقی ومجازی کی رعایت کرے اور کلام کی ترکیب اور اس غرض کی رعایت بھی رکھے جس کے لیے کلام لایا گیا ہے۔

مقدمہ ثالثہ:

بسا اوقات تم دیکھو گے کہ ایک مفسر کسی آیت کے ایک معنی ذکر کرتے ہیں، اور دوسرے مفسر دوسرے معنی، اور کبھی بہت سے معانی ووجوہ بیان کردیتے ہیں جن میں اکثر ایسے ہوتے ہیں کہ حقیقۃً ان میں کوئی اختلاف نہیں، نہ ایسا تردد جو کسی ایک کو لینے سے مانع ہو خصوصا ایسے معنی کو لینے سے جو زیادہ ظاہر اور روشن ہوں، دراصل یہ تعبیرات کا اختلاف اور ایک ہی

مطلب کی مختلف انداز میں ادائیگی ہے، یا نظم کلام متعدد وجوہ ومعانی کا جامع ہے ان میں سے بعض کا اظہار و بیان ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم مختلف معانی اور وجہیں رکھتا ہے اور اس کے ہر لفظ کے متعدد معانی ہیں۔ اس کے عجائب ختم ہونے والے نہیں، اس کے معانی بڑھتے ہیں کسی انتہا پر پہنچنے والے نہیں، لہذا ہر معنی کے اعتبار سے احتجاج واستدلال درست۔ یہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا ہم پر بہت بڑا انعام ہے، اور یہ اعجاز قرآن کی نہایت بلیغ وجہ ہے، اگر معاملہ اس کے برعکس ہوتا تو پھر یہ نعمت ہمارے لیے مصیبت ہو جاتی اور اعجاز قرآن عجز ہو جاتا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کریم کی صفت ''مبین'' ارشاد فرمائی، تو اس کے معانی کا قسم قسم ہونا ایسا نہیں جیسے کسی مبہم کلام میں چند ایسے احتمالات نکلتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے بارے میں تردد اور شبہ رہتا ہے اور مراد واضح نہیں ہو پاتی۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿قُل لَّو كَانَ الْبَحْرُ مِدَاداً لِّكَلِمٰتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبلَ أَن تَنفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّي ، وَلَو جِئنَا بِمِثلِهِ مَدَداً﴾ اے محبوب تم فرماؤ، اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے روشنائی ہو جائے تو سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

ابو نعیم وغیرہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قرآن اپنے اندر مختلف معانی رکھتا ہے، اور آسانی سے معنی کے تابع ہو جاتا ہے، لہذا تم اس کو اچھے معنی پر محمول کرو۔

ابن ابی حاتم نے سیدنا حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت بیان کی کہ آپ نے ارشاد فرمایا: قرآن مختلف معانی ومطالب رکھتا ہے، اور ظاہری وباطنی پہلو بھی رکھتا ہے، اس کے عجائب بے انتہا ہیں، اس کی آخری منزل تک رسائی نہیں ہو سکتی۔

امام سیوطی فرماتے ہیں: ابن سبع نے شفاء الصدور میں فرمایا:

حضرت ابو درداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انھوں نے فرمایا: آدمی اس وقت تک کامل فقیہ نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کے مختلف وجوہ اور معانی نہ نکال لے۔

بعض علما کا قول ہے کہ ہر آیت کے ساٹھ ہزار مفاہیم ومعانی ہیں۔ انتھی ملخصًا

امام بوصیری کی خوبی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، وہ فرماتے ہیں:

قرآنی آیات کے معانی کثیر ہیں، جیسے سمندر کی موجیں اپنی طغیانی میں۔ اور وہ اپنی خوبی وقیمت میں سمندر کے جواہر سے بڑھ کر ہیں۔ لہٰذا قرآنی آیات کے عجائب کی نہ گنتی ہو سکے اور نہ شمار میں لائے جا سکیں۔ انھیں کثرت سے اور بار بار پڑھنے کے باوجود ان سے اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

اب بحمد اللہ ثابت ہو گیا کہ ایسی جگہ قرآن کے ایک معنی دوسرے معنی کے منافی نہیں اور کوئی ایک معنی دوسرے معنی کو چھوڑ دینے کو لازم نہیں کرتے، اسی وجہ سے تم علمائے کرام اور مجتہدین عظام کو دیکھتے ہو کہ وہ ایک معنی لے کر استدلال کرتے ہیں حالاں کہ ان کو یہ علم ہوتا ہے کہ اس کے دوسرے معنی بھی ہیں جن کا ہمارے مبحث سے تعلق نہیں مگر ان کا یہ علم ایک معنی کی بنیاد پر استدلال سے انھیں نہیں روکتا، اور کس لیے روکے گا جب کہ وہ خوب جانتے ہیں کہ قرآن اپنے تمام معانی کے لحاظ سے حجت ہے، اور یہ فنون وانواع کے اظہار ہی کے لیے ہے۔ یہ عظیم قاعدہ ہے جس کی حفاظت لازم ہے۔

ہمیں خبر دی مولیٰ سراج نے، یہ روایت کرتے ہیں مفتی جمال سے، یہ سندِ سندی سے، یہ شیخ صالح سے، یہ محمد بن سنہ اور سلیمان درعی سے، یہ شریف محمد بن عبد اللہ سے، یہ سراج بن الجائی اور بدر کرخی اور شمس علقمی سے، یہ سب حضرات امام جلال الدین سیوطی سے، آپ نے ''الاتقان'' میں ابن تیمیہ سے نقل فرمایا: سلف کی تفسیر میں اختلاف بہت کم تھا، اور وہ اختلاف جس کا ثبوت درجہ صحت کو پہنچا اس کا بھی اکثر حصہ اختلاف نوعی ہے نہ کہ اختلاف تضاد، اس کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت یہ ہے کہ مفسرین میں کوئی اپنی مراد کو ایک عبارت سے تعبیر کریں جو دوسرے مفسر سے جداگانہ ہو مگر معنی دونوں کے ایک ہو، جیسے ﴿الصراط المستقیم﴾ کی تفسیر میں کسی نے ''قرآن'' کہا، یعنی قرآن کی پیروی۔ اور کسی نے ''اسلام''۔ تو یہ دونوں قول ایک دوسرے کے موافق ہیں، اس لیے کہ دین اسلام قرآن کی پیروی ہی تو ہے، لیکن اس جداگانہ تفسیر سے دونوں مفسروں نے علاحدہ علاحدہ وصف شمار کرائے جیسے لفظ ''صراط'' ایک تیسرا

وصف ہے، یہی حال ان حضرات کے اقوال کا ہے جنہوں نے صراط مستقیم کی تفسیر سنت وجماعت۔ یا طریقۂ عبودیت۔ یا اللہ ورسول کی اطاعت اوران جیسے دوسرے معانی بتائے، تو ان سب حضرات مفسرین نے ایک ہی ذات کی طرف اشارہ کیا لیکن اس کی صفات میں کسی ایک صفت کی نشان دہی کی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مفسر کسی اسم عام کی ایک نوع بطور مثال بیان کرے اور سامع ومخاطب کو ایک نوع پر تنبیہ کر دے، اس نوع کو بیان کرنا حد تام کے طور پر نہ ہو جو عموم وخصوص میں اپنے محدود کے مطابق ہوتی ہے، اس کی مثال وہ تفسیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے فرمان:

﴿ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِينَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُمْ مُقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللَّهِ ذَٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيرُ﴾

پھر ہم نے کتاب کا وارث کیا اپنے چنے ہوئے بندوں کو تو ان میں کوئی اپنی جان پر ظلم کرتا ہے اور ان میں کوئی میانہ چال پر ہے اور ان میں کوئی وہ ہے جو اللہ کے حکم سے بھلائیوں میں سبقت لے گیا یہی بڑا فضل ہے۔

کے بارے میں منقول ہوئی۔ اس لیے کہ یہ بات معلوم ہے کہ واجبات کو ضائع کرنے والا اور حرمتوں کو توڑنے والا لفظ ''ظالم'' کا مصداق ہے، اسی طرح ''مقتصد'' واجبات کی تعمیل اور محرمات کے ترک کرنے والے کو شامل ہے، اور ''سابق'' میں وہ داخل ہے جو سبقت کرے اور واجبات کے ساتھ حسنات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے، لہٰذا مقتصد داہنی طرف والے ہیں، اور سابق تو سابق ہیں، وہی اللہ کے مقرب ہیں۔

پھر مفسرین ان تینوں کو عبادات کی کسی ایک نوع میں بیان کرتے ہیں۔ کوئی مفسر کہتا ہے کہ سابق وہ ہے جو اول وقت نماز پڑھتا ہے، اور مقتصد وہ ہے جو درمیان وقت میں، اور ظالم وہ ہے جو سورج زرد ہونے تک نماز کو مؤخر کر دے۔ اور کوئی کہتا ہے: سابق وہ ہے جو زکاۃ کی ادائیگی کے ساتھ حسن نیت سے صدقہ نفل بھی ادا کرے، اور مقتصد وہ ہے جو صرف فرض زکاۃ ادا کرے، اور ظالم وہ ہے جو زکاۃ بھی ادا نہ کرے۔ الخ

امام سیوطی نے امام زرکشی سے نقل فرمایا کہ بسا اوقات مفسرین سے مختلف عبارتیں

منقول ہوتی ہیں، تو جس کو فہم وفراست سے حصہ نہیں ملا وہ یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ یہ اختلاف حقیقی ہے اور وہ ان کو مختلف اقوال کی شکل میں بیان کرنے لگتا ہے حالانکہ بات یہ نہیں۔ بلکہ ہوتا یہ ہے کہ ہر مفسر کوئی ایک ایسا معنی ذکر کرتا ہے جو اس کے نزدیک زیادہ ظاہر ہوتا ہے، یا سائل کی حالت کے زیادہ لائق ہوتا ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مفسر کسی چیز کے لازم اور نظیر کو بیان کرتا ہے۔ اور دوسرا مفسر اس کا مقصود اور ثمرہ ذکر کرتا ہے۔ اور (مقصد وحقیقت کے اعتبار سے) اکثر وبیشتر سب کا بیان ایک ہی معنی کی طرف لوٹتا ہے۔

امام سیوطی نے اس کے بعد امام بغوی اور امام کواشی وغیرہما سے نقل فرمایا کہ تاویل کا مطلب یہ ہے کہ آیت کو استنباط کے طریقے سے کسی ایسے معنی کی طرف پھیرا جائے جو اس کے سیاق وسباق کے موافق ہے اور آیت میں اس معنی کا احتمال بھی ہے، ساتھ ہی کتاب وسنت کے مخالف بھی نہیں، ان تمام قیود کے ساتھ تاویل ان حضرات کو منع نہیں جن کو تفسیر کا علم ہے۔

جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان:

﴿انفِرُوا خِفَافاً وَّ ثِقَالاً﴾ یعنی کوچ کرو ہلکے یا بوجھل۔ اس آیت میں ''خفاف وثقال'' کی تفسیر میں کسی نے جوان اور بوڑھا کہا، کسی نے غنی وفقیر۔ کسی نے شادی شدہ اور کنوارا۔ کسی نے چست اور سست۔ کسی نے صحت مند اور بیمار۔ اور سب تفسیریں روا ہیں۔ اور آیت میں ان سب کا احتمال ہے۔

یہ فصل وسیع وعریض ہے، اگر ہم اس کی تفصیل پیش کریں تو یہ ہمیں مقصود سے خارج کر دے گی۔ ہم نے جو ذکر کر دیا یہ عقل مندوں کے لیے کافی ہے، خصوصاً ان کے لیے جن کی نظر مفسرین کے کلمات اور قرآن مبین سے علما کے بہت سارے استدلال پر گزرتی رہتی ہے۔

مقدمہ رابعہ:

یہ تاویل جس کا ضعف اور کمزوری ظاہر کرنے کے لیے ہم نے کلام کے دروازے کھولے، یعنی ''اتقی'' کی تفسیر ''تقی'' سے کرنا، یہ ابوعبیدہ سے مروی ہے۔ جیسا کہ علامہ نسفی نے تفسیر ''مدارک التنزیل وحقائق التاویل'' میں اس کی صراحت فرمائی۔

ابوعبیدہ طبقہ سابعہ کا ایک نحوی شخص ہے، اس کا نام معمر بن مثنی تھا، خارجیوں کا عقیدہ

رکھتا تھا، زبان دراز، علما کا بدگو تھا، اس کے شاگرد ابوعبید قاسم بن سلام کا حال اس سے اچھا تھا، انہیں حدیث میں بھی اس سے زیادہ مہارت تھی۔

ہمیں خبر دی مفتی مکہ سیدی عبد الرحمٰن نے، انھوں نے روایت کی جمال بن عمر سے، انھوں نے شیخ محمد عابد بن احمد علی سے، انھوں نے فلانی سے، انھوں نے ابن السنۃ سے، انھوں نے مولیٰ شریف سے، انھوں نے محمد بن ارکماش حنفی سے، انھوں نے حافظ ابن حجر عسقلانی سے، علامہ ابن حجر نے تقریب التہذیب میں فرمایا:

معمر بن مثنیٰ ابوعبیدہ تیمی بنوتمیم کا آزاد کردہ بصری نحوی لغوی سچا ہے، تاریخ کا راوی ہے اور خوارج کے مذہب سے متہم تھا، طبقہ سابقہ سے ہے، ۲۰۸ھ میں انتقال ہوا، بعض نے کہا: اس کے بعد وفات ہوئی اور عمر تقریباً سو سال ہوئی۔ انتہی۔

ابن خلکان نے اپنی تاریخ ''وفیات الاعیان'' میں کہا: ابوعبید قاسم بن سلام تشدید لام کے ساتھ ہے، ہرات کے ایک آدمی کے رومی غلام تھے۔ ابوعبید کو حدیث، ادب اور فقہ سے شغل رہا، دین دار، عمدہ سیرت، اچھے مذہب اور نمایاں فضل کے حامل تھے۔ قاضی احمد بن کامل نے کہا: ابوعبید قاسم اپنے دین وعلم میں صاحب فضل وکمال تھے، ربانی عالم، علوم اسلامیہ میں سے قراءت، فقہ، ادب اور تاریخ میں ماہر، نقل و روایت میں بہتر، میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جس نے ان کی دین داری میں طعن کیا ہو۔

ابراہیم حربی کہتے ہیں: ابوعبید گویا ایک پہاڑ تھے جس میں روح ڈال دی گئی ہو، وہ ہر اعتبار سے خوب تھے، ۱۸ سال شہر طرطوس کے قاضی رہے، ابوزید انصاری، اصمعی، ابوعبیدہ، ابن اعرابی، کسائی، فراء اور ان کے علاوہ جماعت کثیر سے روایت کی۔ بہت سے لوگوں نے آپ کی تصانیف کی آپ سے روایت کی، ان تصانیف کی تعداد بیس سے زیادہ ہے، جو علوم قرآن وحدیث، غریب الحدیث، فقہ، وغیرہ سے تعلق رکھتی ہیں، الغریب المصنف، الامثال، معانی الشعر وغیرہ نفع بخش کتابیں ان کی تصنیف ہیں، بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ''غریب الحدیث'' میں کتاب لکھی۔

ہلال بن علا رَقّی کہتے ہیں: چار حضرات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانہ میں

اس امت مسلمہ پر احسان فرمایا۔(۱) امام شافعی کے ذریعہ کہ انہوں نے حدیث رسول کی فقاہت میں یدطولیٰ حاصل کیا۔(۲) امام احمد بن حنبل جو آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے، اگر وہ نہ ہوتے تو لوگ کافر ہوجاتے، (۳) امام یحییٰ بن معین کے ذریعہ انہوں نے حدیث رسول سے کذب وافترا اور موضوع روایات کو دور کردیا۔(۴) ابوعبید قاسم بن سلام کے ذریعہ کہ انہوں نے غریب الحدیث کے معانی ومطالب واضح فرمادیے، اگر یہ نہ ہوتے تو لوگ خطا میں مبتلا ہوجاتے۔

ابوبکر ابن الانباری نے بیان کیا: ابوعبید رات کو تین حصوں میں تقسیم فرماتے، تہائی رات عبادت کرتے، تہائی رات سوتے، اور تہائی رات میں کتابیں تصنیف فرماتے۔

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں:

ابوعبید ہم سے علم میں وسیع، ادب میں ہم سے فراواں، اور ہر فن میں ہم سب سے زیادہ جامع تھے، ہم ان کے محتاج تھے لیکن ان کو ہماری کوئی ضرورت نہ تھی۔

ثعلب نے کہا: اگر ابوعبید بنی اسرائیل میں ہوتے تو حیرت انگیز ہوتے۔

داڑھی اور سر میں مہندی کا خضاب کرتے تھے، رعب ودبدبہ کے مالک تھے، بغداد آئے تو لوگوں نے آپ سے آپ کی تصانیف کی سماعت کی، پھر حج کے لیے روانہ ہوئے، حج کے بعد وہیں رہے اور مکہ ہی میں وصال ہوا۔ بعض نے کہا کہ حج سے فارغ ہوکر مدینہ میں ۲۲۲ھ یا ۲۲۳ھ میں انتقال فرمایا۔ امام بخاری نے ۲۲۴ھ بیان فرمایا ہے، بعض نے ماہ محرم کا بھی ذکر کیا۔ خطیب نے تاریخ بغداد میں تحریر کیا کہ ان کی عمر ۶۷ رسال ہوئی، حافظ ابن جوزی نے ان کا سنہ ولادت ۱۵۰ھ لکھا ہے، ابوبکر زبیدی نے اپنی کتاب ''تقریظ'' میں سنہ ولادت ۱۵۴ھ تحریر کیا، اور یہ بھی لکھا کہ جب ابوعبید حج سے فارغ ہوئے تو واپسی کا ارادہ کیا، لہذا عراق کے لیے سواری کرایہ پر لی، جس رات کوچ کا ارادہ تھا اسی کی صبح خواب میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زیارت سے مشرف ہوئے۔ دیکھا کہ حضور تشریف فرما ہیں، کچھ لوگ حضور کے پاس کھڑے دربانی کررہے ہیں، دوسرے لوگ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر سلام پیش کررہے ہیں اور آپ سے مصافحہ کا شرف بھی پارہے

ہیں، جب میں قریب پہنچا اور داخل ہونے کا ارادہ کیا تو روک دیا گیا، میں نے ان لوگوں سے کہا: مجھے حضور اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملاقات کیوں نہیں کرنے دیتے، بولے: نہیں، خدا کی قسم! نہ تم حضور کی خدمت میں حاضر ہو سکتے ہو اور نہ سلام پیش کر سکتے ہو، اس لیے کہ تم کل عراق جانے کا ارادہ کر چکے ہو۔

میں نے کہا: اگر ایسا ہے تو میں نہیں جاؤں گا، لہذا انہوں نے مجھ سے عہد لیا اور اندر جانے کی اجازت دی، میں نے حاضر ہو کر سلام کیا اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مجھ سے مصافحہ فرمایا، جب صبح کو بیدار ہوا تو کرایہ کی سواری کا معاملہ فسخ کر دیا اور مکہ میں سکونت اختیار کر لی، پھر وصال تک وہیں رہے اور دیار جعفر میں دفن ہوئے۔ بعض نے کہا یہ خواب انھوں نے مدینہ میں دیکھا اور لوگوں کے مدینہ سے واپس جانے کے تین دن بعد وہیں وصال ہوا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ ان کا مولد ہرات ہے۔

اس مقام پر متقدمین علمائے عظام جیسے علم سے بھری گٹھری، حامل تاج المسلمین، یعنی رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نعلین پاک کو اٹھانے والے سیدنا حضرت عبد اللہ بن مسعود، حبر الامت سلطان المفسرین حضرت عبد اللہ بن عباس، حضرت عروہ بن زبیر، ان کے حقیقی برادر اکبر حضرت عبد اللہ بن زبیر، افضل التابعین حضرت سعید بن میسب رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین، کا اس آیت کریمہ کے معنی و مطلب کے تعلق سے مسلک وہ ہے جو ہم نے تم سے روایت کر دیا۔

مقدمہ خامسہ:

اے تفضیلی! شاید تو اس بات پر خوش ہو اور فخر کرے کہ ان بعض مفسرین نے "اتقی" کو "تقی" کی طرف اس لیے پھیرا ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت دوسرے صحابہ پر لازم نہ آئے، حاشا: وہ اس خیال سے بری ہیں، کیا تجھے یہ نظر نہیں آیا کہ جس طرح انھوں نے "اتقی" کی تفسیر "تقی" سے کی، اسی طرح "اشقی" کے معنی "شقی" بیان کیے، تو مفسرین کے اس طریقہ کو تیرے مذموم ارادہ سے کیا تعلق جس کے سبب تو قرآن عظیم کے معانی میں تبدیلی کرنا چاہتا ہے۔ ان کے لیے اس تفسیر کا باعث وہ ہے جو خود ابو عبیدہ نے بیان کیا۔

خبر دی ہمیں سراج العلما نے، انھوں نے مفتی ابن عمر سے روایت کی، انھوں عابد سندی سے، انھوں نے یوسف مزجاجی سے، انھوں نے اپنے والد محمد بن علا سے، انھوں نے حسن عجیمی سے، انھوں نے خیر الدین رملی سے، انھوں نے علامہ احمد بن امین الدین بن عبد العال سے، انھوں نے اپنے دادا سے، انھوں عز عبد الرحیم بن فرات سے، انھوں نے ضیاء الدین محمد بن محمد صنعانی سے، انہوں نے قوام الدین مسعود بن ابراہیم کرمانی سے، انہوں نے مولیٰ حافظ الدین ابو البرکات محمود نسفی سے، امام نسفی نے مدارک التنزیل میں فرمایا: ابوعبیدہ کہتا ہے کہ ''اشقی'' بمعنی ''شقی'' ہے اور ''شقی'' سے مراد کافر، اسی طرح ''اتقی'' بمعنی ''تقی'' ہے اور ''تقی'' سے مراد مومن، اس لیے کہ آگ میں جانا تمام اشقیا میں سب سے بڑے شقی سے خاص نہیں، اسی طرح نجات پانا سارے متقیوں میں سب سے بڑے متقی کا خاصہ نہیں۔ اب اگر تم کہو کہ اللہ تعالیٰ نے نار کو نکرہ ذکر فرمایا، لہٰذا یہاں اللہ تعالیٰ کی مراد وہ نار ہے جو ''اشقی'' سے خاص ہے، تو تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں کیا کہو گے۔ یعنی (وَسَيُجَنَّبُهَا الأَتْقَى) اس سے بہت دور رکھا جائے گا سب سے بڑا پرہیزگار۔ اس لیے کہ ہر متقی اس خاص نار سے دور رکھا جائے گا نہ کہ خاص کر سب سے بڑا متقی۔

تلخیص مقام

بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿فَأَنذَرْتُكُمْ نَاراً تَلَظَّىٰ لَا يَصْلَاهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ﴾

میں تمہیں ڈراتا ہوں اس آگ سے جو بھڑک رہی ہے، نہ جائے گا اس میں مگر بڑا بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر جاری رکھنا ممکن نہیں، اس لیے کہ ظاہری معنی کے لحاظ سے تو اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ دوزخ میں وہی جائے گا جو بدنصیب کافروں میں سب سے بڑا بدنصیب ہوگا، اس سے یہ لازم آئے گا کہ وہ فجار و کفار جو بدنصیبی اور گھمنڈ میں اس سے کم ہوں وہ دوزخ میں نہ جائیں، اور یہ قطعاً باطل ہے۔ اسی معنی پر نظر کرتے ہوئے مفسرین

میں واحدی، رازی، قاضی، محلی، ابوالسعود اور دیگر حضرات نے یہ اختیار کیا اور اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کہا کہ یہاں ''اشقی'' سے کوئی خاص مرد مراد نہیں کہ جس کو سب سے بڑا شقی کہا جائے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شقاوت میں حد کو پہنچا ہوا ہو، اور یہ حال تمام کفار کا ہے، کیوں کہ وہ سعادت سے بالکل محروم ہیں۔ لیکن مومن فاجر تو اس کا ایک پہلو شقاوت فانیہ زائلہ کی طرف ہے تو دوسرا ابدی سعادت کی طرف بھی ہے، اور سعادت ابدی ایمان ہے۔ اس جواب کے بعد جب ان حضرات نے دیکھا کہ ابھی اعتراض بالکلیہ ختم نہ ہوا، اس لیے کہ بعض بدعمل مسلمانوں کا دوزخ میں جانا بھی قطعی ہے، تو اب انھوں نے آیت میں واقع "یصلی" ما دہ "الصلی" کی تاویل "اللزوم" سے کی۔

واحدی نے کہا: یہی اس کے معنی حقیقی ہیں، امام رازی نے ان کا قول اس طرح نقل کیا: حقیقتِ لغت میں ﴿لَا يَصلَاهَا﴾ کے معنی ہیں: لا یلزمھا، کہا جاتا ہے: صلی الکافر النار، جب کافر آگ کو اس کی شدت اور حرارت کی تکلیف برداشت کرتے ہوئے لازم پکڑ لے۔ اور ہمارے نزدیک یہ لزوم صرف کافر کے لیے ہے، رہا فاسق تو وہ یا تو آگ میں داخل ہی نہ ہوگا، یا اگر داخل ہوا تو اس سے چھٹکارا پالے گا۔ انتہی

اقول: میں کہتا ہوں، یہ تاویل کتنی اچھی اور صاف وشفاف تھی اگر اس میں وہ کدورت نہ آتی جو میں جلد ہی بیان کروں گا۔

امام رازی یہاں ایک دوسری تاویل کی طرف مائل ہوکر فرماتے ہیں کہ: اس کے ظاہری معنی کے عموم میں ان آیات کے ذریعہ تخصیص کر دی گئی ہے جو فساق کی وعید پر دلالت کرتی ہیں۔

اقول: یہ تاویل اور تخصیص دونوں کو جمع کرنا ہوا جب کہ اس کی حاجت نہیں، اس لیے کہ اگر تخصیص مان لی گئی تو جس طرح آیات فساق کی وعید پر دلالت کرتی ہیں یوں ہی تمام کافروں کی وعید پر اظہر اور روشن تر طریقہ پر دلالت کرتی ہیں۔

اللھم! مگر یوں کہا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں تو بہت زیادہ تخصیص لازم آئے گی، کیوں کہ اب صرف ایک فرد میں انحصار ہو جائے گا، اور یہ بہت زیادہ دور کی چیز ہوگی۔ خذ ھذا

بے شک قاضی امام ابوبکر باقلانی نے یہاں ایک اچھا مسلک اختیار کیا جیسا کہ امام رازی نے ان سے نقل فرمایا، وہ یہ ہے کہ انہوں نے اشقی کو اس کے حقیقی معنی پر رکھا، یعنی وہ شخص کہ شقاوت اور بدبختی میں اس جیسا کوئی نہ ہو۔ پھر اس حصر کے لیے دو ایسی وجہیں ذکر فرمائیں جن سے عقل مند چین پائے اور دھوکے میں ڈالنے والا ہر شک زائل ہو جائے۔

وجہ اول: اللہ تعالیٰ کے فرمان (نـا را تلظّٰی) میں دوزخ کی آگ سے کوئی خاص آگ مراد ہو۔

اس لیے کہ آگ کے مختلف طبقے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الأسْفَلِ مِنَ النَّارِ﴾ بے شک منافق آگ کے سب سے نچلے طبقے میں ہیں۔ تو آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اس مخصوص آگ میں یہی اشقی جائے گا، اور اس کے یہ معنی نہیں کہ اس بڑے بدنصیب کے سوا دوسرے کافر و فاسق آگ کے باقی طبقوں میں نہ جائیں۔

اقول: تو یہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَيَتَجَنَّبُهَا الأَشْقَى الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى﴾ (اور اس سے وہ بڑا بدبخت دور رہے گا جو سب سے بڑی آگ میں جائے گا) کی طرح ہے جس میں ایک تاویل کی بنیاد "النـار الکبریٰ" سے مراد سب سے بڑی آگ ہے۔

لیکن امام رازی نے اس قول کو یوں رد کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿نـا رأتلظّٰی﴾ (آگ جو بھڑک رہی ہے) میں اس بات کا احتمال ہے کہ وہ سب دوزخوں کی صفت ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ خاص آگ کی صفت ہو، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہی وصف جہنم کی سب آتشوں کا دوسری آیت میں یوں ارشاد فرمایا، ﴿إِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى﴾ (وہ تو بھڑکتی آگ ہے کھال اُتار لینے والی)

اقول: اس عبارت سے اعتراض کی دو جہتیں نظر آتی ہیں:

پہلی وجہ: یہ ہے کہ گویا معترض نے یہ گمان کیا کہ قاضی امام ابوبکر باقلانی اس نار کے لیے لپٹ مارنے کی صفت سے مخصوص ہونے کے مدعی ہیں، جیسے "جـاء غـلا م عـاقـل" میرے پاس عقل مند غلام آیا، اس مثال میں غلام صفت عقل سے مخصوص ہے، اس طریقہ سے وہ فرماتے

ہیں کہ خاص آگ مراد ہے جو سب سے بڑی آگ ہے۔ اس صورت میں اعتراض کا وارد ہونا ظاہر ہے، اس لیے کہ اوصاف ذات کو اسی وقت خاص کرتے ہیں جب وہ اس کا خاصہ ہوں، کہ دوسرے میں نہ پائے جائیں، اور ''تـلـظّـی ''یعنی لپٹ مارنا کسی ایک آگ کے ساتھ خاص نہیں۔

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے جہنم کی آگ کے سلسلہ میں اس کی صفت بیان کرتے ہوئے مطلقاً ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّهَا لَظٰى نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى﴾ (۱۸۷) یعنی وہ تو بھڑکتی آگ ہے کھال اتار لینے والی۔

مگر واضح رہے کہ قاضی امام باقلانی یہ معنی مراد لینے والے نہیں، ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ نار کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے، تو اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿نارًا﴾ کا مطلب ایسی بڑی آگ ہے کہ اس جیسی کوئی دوسری آگ نہیں، گویا نکرہ کی صورت میں بیان فرما کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اشارہ کر دیا گیا کہ وہ عظیم نار اس منزل میں ہے کہ ذہن اس کے سوا کسی اور کی طرف سبقت نہ کریں، اس لیے کہ اس کا معاملہ مشہور ہے، اس کا خوف عام ہے، اور اس کے ہولناک احوال کی ہیبت دلوں پر چھائی ہوئی ہے۔ تو اس کی شہرت اور اس کا چرچا عام ہونے کے سبب اس کا نام لینے سے بے نیازی ہے۔ جیسے یہی فائدہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں وارد لفظ ﴿مـلـيك﴾ کی تنکیر سے حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿فِی مَـقْـعَدِ صِدْقٍ عِندَ مَلِيكٍ مُّقْتَدِرٍ﴾ (سچ کی مجلس میں عظیم قدرت والے بادشاہ کے حضور) اور یہی فائدہ لفظ ﴿ظلم﴾ کی تنکیر سے ہوا جو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہے: ﴿اَلَّـذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُمْ بِظُلْمٍ. أُولٰئِكَ لَهُـمُ الْاَمْـنُ وَهُـمْ مُهْتَـدُونَ﴾ (وہ جو ایمان لائے اور اپنے ایمان میں کسی ناحق (ظلم) کی آمیزش نہ کی انہیں کے لیے امان ہے اور وہی راہ پر ہیں) یعنی ایسا ظلم کہ کوئی اور ظلم اس جیسا نہیں، اور وہ شرک ہے۔

ہمیں خبر دی مولانا سید حسین جمل اللیل امام شافعیہ مکہ معظمہ نے، انھوں نے روایت کی خاتمۃ المحدثین محمد عابد سندی سے، انھوں نے صالح فلانی سے، انھوں نے محمد بن سنہ سے، انھوں نے احمد عجلی سے، انھوں نے قطب الدین نہروالی سے، انھوں نے ابو الفتوح سے،

انھوں نے یوسف ہروی سے، انھوں نے محمد بن شاد بخت سے، انھوں نے ابونعمان ختلانی سے، انھوں نے فربری سے، انھوں نے محمد بن اسماعیل بخاری سے، یہ کہتے ہیں کہ حدیث بیان کی ہم سے ابوالولید نے، یہ کہتے ہیں شعبہ نے، انھوں نے روایت کی سلیمان سے، انھوں نے ابراہیم نخعی سے، انھوں نے علقمہ سے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: ﴿ اَلَّذِینَ آمَنُوا وَلَم یَلبِسُوا اِیمَانَھُم بِظُلمٍ. اُولٰئِكَ لَھُمُ الاَمنُ وَھُم مُھتَدُونَ﴾

تو صحابۂ کرام نے کہا: ہم میں کون ہے جس نے ظلم نہیں کیا؟ تو اللہ تعالیٰ نے ﴿اِن الشرك لَظُلمٌ عَظِیمٌ﴾ (بے شک شرک بڑا ظلم ہے) نازل فرمایا۔

خبر دی ہمیں شیخ العلما مولانا سید احمد زینی دحلان مکی شافعی نے، انھوں نے علامہ عثمان بن حسن دمیاطی شافعی ازہری سے، انھوں نے امیر کبیر علامہ محمد مالکی ازہری اور شیخ عبداللہ شرقاوی شافعی اور سیدی محمد شنوان شافعی سے، اور دوسرے حضرات نے اپنی سند سے امام مسلم بن حجاج نیشاپوری سے، انہوں نے اپنی سند سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی، اس روایت میں اس طرح ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے عرض کیا، ہم میں کون ایسا ہے جو اپنے نفس پر کچھ بھی ظلم نہ کرتا ہو۔ یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اس آیت میں وہ نہیں جس کا تم گمان کرتے ہو، یہ ایسا ہی جیسے حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا: ﴿ یَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ، اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِیمٌ﴾ (اے میرے بیٹے اللہ کا کسی کو شریک نہ کرنا بے شک شرک بڑا ظلم ہے)

اسی طرح امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں، اور امام ترمذی نے اپنی جامع میں اس روایت کی تخریج فرمائی۔

اسی طرح کی توجیہ خود امام رازی نے بھی اس آیت میں اختیار فرمائی، یعنی ﴿اَرَاَیتَ الَّذِي یَنهٰی عَبداً اِذَا صَلّٰی﴾ (بھلا دیکھو تو جو منع کرتا ہے بندہ کو جب وہ نماز پڑھے) کہ "عبداً" میں تنکیر اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم عبو دیت میں کامل تھے، گویا اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وہ ایسے بندے ہیں کہ تمام جہان میرے اس

محبوب بندے اور رسول کی حقیقت بیان کرے اور عبودیت میں ان کے اخلاص کے اوصاف ذکر کرے تو وہ ان کا حق نہیں ادا کر سکتا۔

دوسری وجہ: یہ ہے کہ آگ کی صفت ''تلظی'' بیان فرمانا اس تخصیص کے منافی اور اس کی ضد ہے، اس لیے کہ یہ صفت ہر آگ کی ہے یعنی بھڑکنا اور لپٹ مارنا، ایسا نہیں کہ کسی خاص آگ میں یہ صفت پائی جاتی ہو۔

اقول: اس اعتراض کی کوئی حیثیت نہیں، اس لیے کہ کسی جنس کے عظیم فرد کو ایسے عام وصف کے ذریعہ بیان کرنا جس میں تمام افراد شریک ہوں ممتنع نہیں۔ ہاں اس کا عکس ضرور ممتنع ہے، یعنی تمام افراد کو کسی ایک ایسے وصف سے متصف کیا جائے جو کسی خاص فرد کی صفت ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿ومَا مُحَمَّدٌ إلّا رَسُولٌ﴾ (اور محمد تو ایک رسول ہیں)

حالاں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تمام رسولوں سے مطلقا افضل واعلیٰ ہیں، اور رسالت ایک وصف عام ہے جس میں سب رسول شریک ہیں۔

واضح رہے کہ گذشتہ آیت ﴿فأنذرتُكم نارًا تَلَظّىٰ﴾ میں کوئی ایسا لفظ بھی نہیں جو حصر پر دلالت کرتا ہو اور عموم کے منافی ہو، اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ ''تَلَظّی'' یعنی بھڑکنا، کلی مشکک ہے، تو یہاں کوئی خاص تلظی مراد لینا بھی جائز ہوگا، یعنی ایسی تلظی کہ اس جیسی کوئی دوسری تلظی نہیں۔ جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ﴿يٰأيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيكُم أنفُسَكُم لَا يَضُرُّكُم مَن ضَلَّ إذَا اهتَدَيتُم﴾ (اے ایمان والو! تم اپنی فکر رکھو، تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا وہ جو گمراہ ہوا جب کہ تم راہ پر ہو) کہ اس آیت میں ضلال کہا، اور ضلال بعید مراد لیا اور یہ کفر ہے۔

امام احمد بن حنبل، اور امام طبرانی وغیرہما محدثین نے حضرت ابو عامر اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی: میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس آیت کے بارے میں پوچھا تو ارشاد فرمایا: تمہارا کچھ نہ بگاڑے گا وہ جو گمراہ ہوا یعنی کافر، جب کہ تم راہ پر ہو۔

تعجب ہے کہ امام رازی خود اسی طرح کی توجیہ کی طرف ﴿نَارٌ حَامِيَةٌ﴾ میں مائل ہوئے۔ اس مقام پر انھوں نے ارشاد فرمایا: مطلب یہ ہے کہ ہر آگ جہنم کی آگ کے مقابل گو

یا گرم ہی نہیں، اور اتنی بات جہنم کی آگ کی سخت گرمی پر تنبیہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ نعوذ باللہ منھا الخ۔ تو یہ کیا بات ہے کہ جو کھایا بھی جائے اور پھر اس کو مذموم بھی کہا جائے۔" فماللشعیر یؤکل ویذم".

اقول: یہاں ایک بات تم یہ بھی کہہ سکتے ہو کہ لفظ "لظی" مجرد ہے اور "تلظی" مزید فیہ، اور لفظ کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ اہل فن نے رحمٰن ورحیم اور ان کے علاوہ کے بارے میں کہا ہے: ساتھ ہی ایک اعتبار یہاں اور بھی ہے، وہ یہ کہ وہ کلمہ جس میں لفظاً تشدید ہو وہ معنیٰ شدت کی خبر دیتا ہے جیسے "قتل" و "قتّل" میں اور "قاتل" و "قتّال" میں ہے (تو "تلظّی" میں لفظاً تشدید ہے جو معنوی شدت کی خبر دے رہی ہے) اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ادعا کا باب کشادہ ہے، اور صفت کو سب سے عظیم موصوف پر مقصور ومنحصر رکھنا شائع اور کثیر الاستعمال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مہاجرین کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا: ﴿أُولٰئِكَ هُمُ الصّٰدِقُونَ﴾ یہی لوگ سچے ہیں۔ اسی طرح تم اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيعُ العَلِيمُ﴾ (بیشک وہی سنتا جانتا ہے) جیسے تمام ارشادات کو اسی قبیل سے قرار دے سکتے ہو۔ اس مسئلہ کی تحقیق ہم نے اپنے رسالہ "سلطنة المصطفیٰ فی ملکوت کل الوریٰ" کے خاتمہ میں انتہا کو پہنچادی ہے۔ اسے ذہن نشین رکھو۔

قاضی امام ابوبکر باقلانی نے جو توجیہ "اشقی" کے بارے میں ذکر فرمائی معلوم ہوتا کہ اس کی طرف ابوعبیدہ کا دل مائل ہوا تھا۔ پھر اسے کچھ اور سمجھ میں آیا اس لیے اس کے ذکر سے باز رہا۔ جیسا کہ اس کا کلام ہم نے تم سے بیان کیا۔ عن قریب اس کا جواب سن لوگے، انشاء اللہ تعالیٰ،

وجہ ثانی: اشقی کو معنی حقیقی پر محمول کرتے ہوئے حصر کے درست ہونے کے لیے قاضی ابوبکر باقلانی نے جو دوسری وجہ ذکر فرمائی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ﴿نَاراً تَلَظّٰى﴾ سے مراد تمام دوزخیں ہیں۔ اور آیت کریمہ ﴿لَا يَصْلٰهَا إِلَّا الأَشْقٰى﴾ (اس آگ میں نہ جائے گا مگر وہ سب سے بڑا بد بخت) سے مراد یہ ہے کہ یہ سب سے بڑا بد بخت دوزخ کا

سب سے زیادہ حق دار ہے اور استحقاق کی زیادتی اسی سب سے بڑے بدبخت کو حاصل ہے۔

انتہی۔

اسی کے قریب قریب وہ توجیہ ہے جس پر زمخشری نے کشاف میں جزم کیا اور اسی کے بیان پر اکتفا کیا۔ امام نسفی نے بھی زمخشری کی اس توجیہ کو نقل فرمایا۔ وہ توجیہ یہ ہے کہ یہ آیت مو منین اور مشرکین کے دو بڑے شخصوں کی دو حالتوں میں موازنہ کے طور پر وارد ہوئی جس سے ان کی دونوں متناقض اور متضاد صفتوں میں مبالغہ مقصود ہے، لہذا ''اشقیٰ'' فرمایا گیا اور اسے جہنم کی آگ میں جانے کے لیے مخصوص ٹھہرایا گیا، گویا جہنم کی آگ اسی کے لیے پیدا ہوئی ہے ۔اور ''اتقی'' فرمایا اور اس کو نجات کے ساتھ خاص کیا، گویا جنت انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔انتہی۔

اقول: یہی وہ حصر ادعائی ہے جس کا بیان ہم نے تم سے کیا، بلاشبہ یہ طریقہ فصحا و بلغا کے درمیان دائر و سائر ہے، اس کی شہادت ہر وہ شخص دے گا جس نے عربی شعرا کے دیوان اور مدح و ہجو میں ان کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا، نیز اہل فن یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ زمخشری کو فنون ادب اور ادیبوں کی صنعتوں میں بڑی دسترس اور اونچا مقام حاصل تھا، لہذا امام رازی کا زمخشری پر یہ اعتراض کہ اس نے ظاہری معنی کو بلا دلیل ترک کیا، خوب نہیں۔ تصحیح کلام کی ضرورت سے بڑھ کر کون سی دلیل ہوگی؟ اشقی کی تاویل شقی سے کرنا (جس کا ذکر امام رازی کے کلام میں ہے) اس حصر کی بہ نسبت ظاہر سے قریب تر نہیں۔ جب کہ حصر ادعائی عرف میں شائع بھی ہے، اور نثر و نظم دونوں میں بکثرت واقع بھی ہے۔ اور کلام کی تصحیح اور درستگی ایسے مقامات پر قرینہ کافیہ ہے۔

یہ دیکھو! جب تم کسی شخص کو کہتے ہوئے سنتے ہو ''زید هو الكريم'' تو اس سے تم پہلی فرصت میں یہ سمجھ لیتے ہو کہ متکلم کی مراد یہ ہے کہ ''زید جیسا کوئی کریم نہیں'' یہ نہیں سمجھتے کہ ''زید کے سوا کوئی کریم نہیں'' یہ بات بالکل واضح ہے۔

یہ بات تو اشقی کے تعلق سے تھی، بلاشبہ یہاں ظاہر کلام کسی تاویل یا توجیہ کا محتاج ہے، لیکن ابو عبیدہ نے یہاں شطرنج میں ایک خچر کا اضافہ کر دیا۔ پھر بعض متاخرین اس کے کلام کو بغیر

تنقیح پے در پے نقل کرتے رہے۔ جیسا کہ ہم نے امام سیوطی کے کلام سے ان متاخرین کی عادت بیان کی۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ ابوعبیدہ نے یہ گمان کرلیا کہ آیت ''اتقی'' بھی تاویل کی محتاج ہے، اس لیے کہ وہ بیان کرتا ہے کہ اگر تم کہو کہ اللہ تعالیٰ نے ''نار'' کو نکرہ ذکر فرمایا ہے۔ الخ پھر فوراً اس نے ''اتـقـی'' کو ''تـقـی'' کے معنی میں لے لیا تاکہ یہ ہر مومن کو شامل ہو جائے، اس گمان میں زمخشری وغیرہ نے بھی اس کی موافقت کی، لیکن وہ اس کی تاویل سے متفق نہیں۔ جیسا کہ تم سن چکے۔

واضح رہے کہ یہ بات کسی بنیاد پر قائم نہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الأتقىٰ﴾ میں کوئی لفظ ایسا نہیں جو حصر وقصر پر دلالت کرے، اللہ تعالیٰ تو اپنے اس بندہ کا وصف بیان فرمارہا ہے جو سب سے بڑا پرہیز گار ہو، کہ وہ جہنم کی آگ سے بہت دور رکھا جائے گا، یہ مطلب نہیں ہے کہ جہنم کی آگ سے صرف وہی بچایا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ امام رازی پر رحم فرمائے کہ انہوں نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا، اسی لیے انہوں نے ''اشقی'' کے بارے میں تو ایک قول ذکر کیا کہ وہ ''شقی'' کے معنی میں ہے، لیکن ''اتـقـی'' کے بیان میں ایسا کوئی قول سرے سے ذکر ہی نہیں فرمایا، بلکہ اس کے خلاف صراحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: یہ آیت غیر اتقی کے حال پر کچھ بھی دلالت نہیں کرتی، مگر مفہوم مخالف، اور دلیل خطاب سے استدلال کے طور پر۔ الخ۔

اقول: بلکہ یہ بات مفہوم صفت ماننے والوں کے مذہب پر بھی درست نہیں، اس لیے کہ یہ کلام ''اتقی'' کی مدح میں لایا گیا ہے جیسا کہ شان نزول اس پر دلالت کرتی ہے، اور مقام مدح وذم میں ان کے نزدیک بھی مفہوم صفت معتبر نہیں جیسا کہ کتب اصول فقہ میں مذکور ہے۔

اب قاضی بیضاوی شافعی پر نہایت تعجب ہے کہ انہوں نے مفہوم سے کیوں کر استدلال کیا جب کہ بالاتفاق یہ اس کا مقام نہیں، اور ان سے زیادہ سخت تعجب تو امام ابوبکر باقلانی شافعی پر ہے۔ کہ ان کے قلم سے لغزش ہوئی اور وہ اس طرف مائل ہوئے کہ آیت حصر کا فائدہ دیتی ہے حالانکہ وہ قول بالمفہوم میں اپنے ائمہ کے بالکل مخالف ہیں۔

اللہ تعالیٰ یونہی اپنی نشانیاں ہمیں آفاق میں اور ہمارے اپنے نفوس میں دکھاتا ہے تا

کہ کوئی اپنی باریک بینی پر مغرور نہ ہو اور افکار میں لغزش کرنے والے پر کوئی ہنسنے والا نہ ہنسے، اس لیے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شمشیر بُرّاں خطا کرتی ہے اور ہر خوش رفتار گھوڑا منہ کے بل گرتا ہے، تو گھمنڈ کس بات پر؟۔

اللہ تعالیٰ ان حضرات کے پاک زمانہ کو سیراب کرے جنھوں نے فرمایا، اور تم کیا جانتے ہو کہ وہ عظیم شخصیات کون تھیں جن کا یہ قول ہے، سنو! یہ ہیں امت کے سرداران و پیشوا امام ابراہیم نخعی اور امام مالک بن انس اور ان کے علاوہ دوسرے ائمہ کرام جنہوں نے فرمایا اور کیا خوب فرمایا:

ہر شخص کی کوئی بات مقبول ہوتی ہے اور کوئی غیر مقبول، مگر اس قبر انور کے مکین، یعنی حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کہ آپ کی ہر بات قبول ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ابتدا و انتہا ہر حال میں حفاظت کے طلب گار ہیں۔ والحمد لله رب العالمين۔

اب وہ وقت آ گیا کہ ہم ابو عبیدہ کا رد و ابطال کریں اس بات میں جس سے اس نے راہ فرار اختیار کی اور اس میں جس پر وہ مطمئن ہوا تھا۔

فأقول وبالله التوفيق:

اولاً: اس شخص نے یہ گمان کیا کہ "اشقی" کے معنی "شقی" مراد لے کر اس آفت سے نجات مل جائے گی جس میں وہ مبتلا ہے، اس لیے کہ کلام کا مرجع و مآل یہ ہوا کہ آگ میں کافر ہی جائے گا اور یہ بات بالکل حق اور بے غبار ہے۔

قلنا: تم نے موصوف کو دیکھا مگر صفت کو نظر انداز کر دیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿لَا يَصْلٰهَا إِلَّا الْأَشْقَى الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلّٰى﴾ اس میں نہ جائے گا مگر وہ سب سے بڑا بدبخت جس نے جھٹلایا اور منہ پھیرا۔

واضح رہے کہ کفار میں وہ بھی ہیں جنھوں نے اپنی پوری عمر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو نہ دل سے جھٹلایا، نہ زبان سے، اس کا کفر تو یوں ہوا کہ نوشتۂ تقدیر غالب آیا اور توفیق ربانی نے ساتھ نہ دیا۔ والعياذ بالله المولى الكريم۔

اقول: یہ ہیں ابو طالب، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے چچا، جنہوں نے اپنی عمر

آپ کی حفاظت وحمایت میں بسر کی، اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت ونصرت میں آخری حدتک گئے، حضور کی محبت ان کے دل پر اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اپنے صلبی کم سن بچوں پر بھی آپ کو ترجیح دیتے۔ جب حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان فرمایا اور مشرکین دور دراز سے آپ پر حملہ آور ہوئے۔ اس مشکل وقت میں ابو طالب آپ کی حمایت میں کافروں سے لڑنے کے لیے کھڑے ہو گئے، اور آپ کے ساتھ عظیم حسن سلوک سے پیش آئے، ہر وقت آپ کی مدد میں کمر بستہ رہے، اور بے شمار سختیاں تو وہ جھیلیں جو اپنے سب سے نزدیک گھرانے اور قریب تر رشتہ داروں میں سے مشرکین کے مقاطعہ کے وقت پیش آئیں۔ یہ وہی ابو طالب ہیں کہ جب تمام قریش حضور محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مخالف ہوئے اور قبول اسلام کے خواہش مند لوگوں کو حضور سے نفرت دلانے لگے تو انھوں نے ایک قصیدہ کہا جو حضور احمد مجتبیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے غایت محبت کی علامت اور آپ کے دشمنوں سے شدید عداوت کی دلیل ہے۔

اس قصیدہ کو صاحب مغازی ابن اسحاق ودیگر معتبر راویوں نے روایت کیا، اس قصیدہ کے کچھ اشعار یہ ہیں:

(۱) اے عبد مناف کے بیٹو! تم اپنی قوم میں سب سے بہتر ہو، تو تم اپنے معاملہ میں کسی خسیس ورذیل کو شریک نہ کرو۔

(۲) مجھے خوف ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تمہارا حال ٹھیک نہ کیا تو تم وائل کے افسانوں کی طرح ایک افسانہ ہو جاؤ گے۔

(۳) میں لوگوں کے رب کی پناہ چاہتا ہوں ہر برائی کا طعنہ دینے والے اور باطل پر اصرار کرنے والے سے۔

(۴) اور کینہ پرور سے جو ہم پر کسی عیب کی چغلی کرے اور اس شخص سے جو دین میں ایسی بات شامل کرے جو اس نے نہ چاہی۔

(۶) اور اللہ تعالیٰ کے سچے گھر کی قسم اور اللہ کی قسم بیشک اللہ تعالیٰ بے خبر نہیں۔

(۷) اللہ کے گھر کی قسم اے کافرو تم جھوٹے ہو اس گمان میں کہ ہم محمد صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم کو چھوڑ دیں گے۔ حالاں کہ ابھی ہم نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گرد نیزوں اور تیروں سے جنگ نہ کی۔

(۸) اور کیا ہم محمد مصطفیٰ۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ کو تمہارے سپرد کر دیں گے جب تک کہ ہم ان کے گرد تہ تیغ نہ ہو جائیں اور اپنے بیٹوں اور بیویوں سے غافل نہ ہو جائیں۔

(۹) مجھے اپنی جان کی قسم مجھے محمد۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ۔ سے شدید محبت ہے اور میں انھیں ایسا چاہتا ہوں کہ جس طرح پیہم چاہنے والے کی عادت ہوتی ہے۔

(۱۰) جب فیصلہ کرنے والے مقابلے کے وقت کسی کو اس پر قیاس کریں تو ان جیسا لوگوں میں کون ہے جس کے لیے یہ امید ہو کہ وہ ان کا ہم پلہ ہوگا۔

(۱۱) حلم والے، رشد والے، عقل والے، طیش والے نہیں۔ وہ خدا سے محبت رکھتے ہیں جو ان سے غافل نہیں۔

(۱۲) تو خدا کی قسم اگر اس کا اندیشہ نہ ہوتا کہ میں ایسا کام کروں جو ہمارے بزرگوں پر محافل میں ملامت کا سبب بنے۔

(۱۳) تو ہم نے زمانہ کی ہر حالت میں ان کی پیروی کی ہوتی یہ بات سنجیدگی سے بے مذاق کے کہتا ہوں۔

(۱۴) تو احمد۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ ہمارے اندر ایسے عالی نسب ہیں جس کو پانے سے فخر کرنے والے کی تیزی عاجز ہے۔

(۱۵) میں نے خود ان کے ساتھ مہربانی اور ان کی حمایت کی اور سرداروں اور گروہوں کے ذریعہ (یا سروں اور سینوں کے ذریعہ) دشمنوں سے حضور کا بچاؤ کیا۔

اسی کے ساتھ ابو طالب حضور نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے برکت طلب کرتے اور دعا میں حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کو وسیلہ بناتے۔ چنانچہ اس پر قریش کی قحط سالی اور سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وسیلہ سے بارش طلب کرنے کا واقعہ جسے علمائے کرام نے روایت فرمایا ہے دلالت کرتا ہے۔ اور بے شک ابو طالب نے لوگوں کو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اتباع پر ابھارا اور ان باتوں کی خبر دی جو واقع نہ ہوئی تھیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کا گمان سچا کیا اور ایسا ہی

ہوا جیسی انھوں نے خبر دی تو وہ حضور کے دل میں اتر گئے اور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل
میں ان کے لیے مقام عظیم تھا۔ یہاں تک کہ جب سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں ایک
اعرابی نے آکر عرض کیا کہ ہم سرکار کے پاس آئے ہیں اور حال یہ ہے کہ ضعف سے ہمارے
بچوں کی آواز نہیں نکلتی اور ہمارے اونٹ لاغری کی وجہ سے بولتے نہیں، اور ان اعرابی نے سرکار
کی مدح میں کچھ اشعار پڑھے تو سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام چادر اقدس کو گھسیٹتے ہوئے اٹھے اور منبر
پر صعود فرمایا اور آسمان کی جانب اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے تو خدا کی قسم ابھی سرکار نے اپنے ہاتھ
نیچے نہ کیے تھے کہ آسمان بادلوں اور بجلیوں سے بھر گیا اور اس قدر بارش ہوئی کہ لوگ پکارتے
ہوئے آئے کہ ہم ڈوبے۔ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تبسم فرمایا یہاں تک کہ دندان اقدس چمکے
اور آپ کو اپنی تعریف میں ابو طالب کا قول یاد آیا جب انہوں نے عرض کیا تھا کہ سرکار گورے ہیں
جن کے چہرے سے بارش طلب کی جاتی ہے جو یتیموں کا بھروسہ اور بیواؤں کا سہارا ہیں۔

پھر سرکار علیہ الصلاۃ والسلام نے فرمایا: اللہ کے لیے ابو طالب کی خوبی ہے اگر وہ
زندہ ہوتے تو ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔ کون ہمیں ان کے شعر سنائے گا تو حضرت علی کرم
اللہ وجہہ نے عرض کیا: گویا سرکار کی مراد ان کا وہ قصیدہ ہے جس میں انہوں نے عرض کیا ہے:

وہ گورے رنگ والے جن کے چہرے کے ذریعہ بارش طلب کی جاتی ہے۔

اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے چند شعر پڑھے تو سرکار نے فرمایا: ہاں میں یہی
چاہتا تھا، جیسا کہ بیہقی نے دلائل النبوۃ میں سیدنا انس سے روایت کیا۔

تو سرکار ابد قرار علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قول "للہ درّ أبي طالب" (اللہ کے لیے
ابو طالب کی خوبی ہے) کو دیکھو اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اس ارشاد پر نظر کرو کہ ہمیں
کون ابو طالب کے شعر سنائے گا۔ اور ایک بار بھی منقول نہ ہوا کہ ابو طالب نے سرکار کی کسی
بات کو رد کیا ہو۔ یا سرکار کو جھٹلایا ہو، بلکہ خود اسی قصیدہ میں قریش سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ
"خدا کی قسم لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا فرزند ہمارے نزدیک ایسا نہیں کہ جھٹلایا جائے اور نہ اسے
جھوٹی باتوں سے کام ہے"۔ اسی وجہ سے ابو طالب پر تمام دوزخیوں سے ہلکا عذاب ہے جیسا
کہ صحیح حدیثوں میں وارد ہوا۔ اور شفیع مرتجیٰ، امید گاہ عاصیاں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ کی

شفاعت نے انہیں نفع دیا تو ان پر تخفیف کے لیے انہیں جہنم کے بالائی سرے پر رکھ دیا گیا اور یہ معاملہ ان کے ساتھ سارے کافروں کے برخلاف ہے جنھیں شفیعوں کی شفاعت کام نہ دے گی۔ اور کاش وہ ایمان لاتے تو نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے افضل صحابہ سے ہوتے۔ لیکن اللہ کا لکھا نہیں ٹلتا اور اس کا حکم نہیں بدلتا اور اللہ ہی کے لیے ہے حجت بلند۔ اور معصیت سے پھرنے کی قوت اور اطاعت کی طاقت اللہ عزیز حکیم کے دیے بغیر نہیں۔ ہم نے اس مسئلہ کو اپنے بعض فتاویٰ میں تفصیل سے بیان کیا اور ابوطالب کے اسلام کے قائل کی رائے کا بطلان ظاہر کیا ہے۔

جب بات یوں ہے تو ظاہر ہوا کہ حصر شقی مکذب (جھٹلانے والے) میں بھی درست نہیں، اسی طرف قاضی امام ابوبکر نے اشارہ کیا، چنانچہ انھوں نے فرمایا کہ اس آیت کو اس کے ظاہری معنی پر جاری کرنا ممکن نہیں اور اس پر تین وجوہ دلالت کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ حصر اس کا مقتضی ہے کہ جہنم میں وہی کافر جائے گا جو سب سے بڑا بدبخت ہو جس نے نبی علیہ الصلوۃ والسلام کی تکذیب کی ہو اور ان کی سچائی کے دلائل میں نظر سے اعراض کرتا ہو۔ تو لازم آیا کہ وہ کافر جس سے تکذیب واعراض سرزد نہ ہوا۔ (جیسے ابوطالب) جہنم میں نہ جائے۔

قلت: جس طور پر ہم نے کلام کی تقریر کی اس سے امام رازی کے اس قول کا ضعف ظاہر گیا جو انھوں نے امام قاضی پر بطور اعتراض تحریر کیا ہے کہ ہر کافر کا نبی کو اس کے دعویٰ میں جھٹلانا ضروری ہے اور اس نبی کے دلائل صدق میں نظر سے روگردانی لازم ہے۔ اور یہ بھی ظاہر ہوا کہ یہ تاویل جسے بہت سے متاخرین نے پسند کیا کوئی حاجت پوری نہیں کرتی اور نہ تشنگی کو بجھاتی ہے، تم پر لازم ہے کہ غور وفکر سے کام لو۔

ثانیاً: ابوعبیدہ نے دوسری بات اپنے گمان سے یہ کہہ ڈالی کہ وہ آیت جو اتقی کے بارے میں ہے وہ بھی اپنے ساتھ والی آیت کی طرح محتاج تاویل ہے، لہٰذا یہ ایسی چیز کا ارتکاب کر بیٹھا جس کی کوئی حاجت نہیں تھی۔ جیسا کہ ہم نے کامل تحقیق سے آپ پر واضح کر دیا۔

ثالثاً: اسی نے تیسری بات اپنے گمان سے یہ کہہ دی کہ اتقی کے معنی ''تقی'' لینا مفید اور کارآمد ہے، اس لیے کہ اس کے گمان کے مطابق آیت مذکور میں متقی کے علاوہ کوئی بھی دوزخ کی آگ سے دور نہ رکھا جائے گا۔

اقول: اس پر وہ اعتراض وارد نہیں ہوتا جس کے بارے میں گمان ہوسکتا ہے، (یعنی جب متقی ہی دوزخ سے بچے گا) تو پھر اللہ تعالیٰ کی وہ رحمت کہاں گئی جو نافرمانوں پر ہوگی، اور قطعی دلائل اس بات کی وضاحت کر چکے کہ بہت سے بدعمل اور گناہوں کے بوجھ سے دبے ہوئے اور مرتے دم تک گناہوں کے عادی بھی قیامت میں رحمت عزیز غفار جل جلالہ اور شفیع احمد مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شفاعت سے جہنم کی آگ کی بھنک تک نہ سنیں گے۔ اعتراض وارد نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ تقویٰ کے درجات اور مراتب ہیں، سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ کفر سے بچے، اس میں تمام مومن برابر کے شریک، اور ابو عبیدہ نے اپنی مراد پہلے ہی واضح کر دی تھی کہ اتقی بمعنی تقی ہے اور تقی کا معنی مومن ہے، (خواہ گنہ گار ہو یا نیکوکار)

اقول: اس تفصیل سے وہ اعتراض بھی دفع ہو گیا جو بچوں اور پاگلوں کے ذریعہ کیا جاتا ہے کہ وہ پھر کس خانہ میں رہیں گے، کیونکہ جب تقی سے مراد مومن ہے تو بچہ اگر سمجھ والا ہے تو اس کا ایمان واسلام معقول ومقبول، اور جنون اگر طاری ہے یعنی پہلے صحیح تھا بعد میں ہمیشہ وہ پاگل ہی رہا تو اس کے جنون سے پہلے کا اسلام مانا جائے گا، یہ دونوں صورتیں نہ ہوں تو ان پر فطرت اسلامیہ کے احکام جاری ہوں گے۔ (بہر حال آیت کے تحت داخل)

لکنی اقول: لیکن میں کہتا ہوں:

اولاً: جب اتقی بمعنی تقی ٹھہرا تو اس صورت میں اس الف لام کو کون سا قرار دو گے؟ اس لیے کہ اصول میں ثابت ہو چکا کہ لام اگر عہد کے لیے نہ ہو گا تو استغراق کے لیے ہوگا (مذکورہ صورت میں عہد کے لیے نہیں ہوسکتا کہ تقی کے معنی مومن ہیں) اور یہ بخوبی معلوم ہے کہ مومنوں میں بعض وہ بھی ہیں جنہیں عذاب ہوگا اور جہنم کی آگ سے نہ بچائے جائیں گے۔ (اس صورت میں لام استغراق کے لیے بھی نہ رہا) کوئی جواب میں کہنے لگے کہ "یصلی" کے معنی فقط آگ میں جانا نہیں بلکہ اس کا لازم ہونا اور ہمیشہ رہنا ہے تو اس کا یہ کہنا مفید نہیں)

اس لیے کہ "سیجنبھا" عن قریب اس کو دوزخ سے دور رکھا جائے گا، اس آیت میں ضمیر "ھا" دوزخ کی آگ کی طرف لوٹ رہی ہے، نہ کہ "صلی" مصدر کی جانب (اس کا معنی آگ میں جانا یا ہمیشہ رہنا ہے) اس مقام پر جس کا ذہن ان باتوں میں سے بعض کی طرف

پہنچا اس نے عجیب وغریب باتیں کہیں، جیسے علامہ قاضی بیضاوی، انہوں نے کلام کو اس بات پر محمول کیا کہ تقی کے معنی ہیں جو کفر وگناہ سے بچے۔

اقول: ہاں اب استغراق تو درست ٹھہرا، لیکن اس حصر کے بارے میں کون جواب دے گا جس کو بعض لوگ گمان کیے بیٹھے ہیں اور اسی حصر کے خیال خام کی بنیاد پر "اتقی" میں تاویل کرتے ہیں، اس لیے کہ فاجروں بدکاروں میں بعض ایسے بھی تو ہوں گے جن کو دوزخ کی آگ سے بچایا جائے گا اور عذاب نہ ہوگا۔ کما ذکرنا، اس صورت میں بچے اور پاگل کے ذریعہ بھی اعتراض قائم ہوسکتا ہے کہ یہ بھی متقی اور پرہیزگار میں شمار نہیں کیے جاتے۔

وأقول ثانیاً: دوسری بات ہماری یہ سنو کہ ہم نے ان تمام باتوں کو نظر انداز کردیا اور آپ کو آپ کے حال پر چھوڑ دیا کہ کلام کو جس معنی پر چاہیں محمول کریں، مگر اس بات کا خیال رکھیں کہ آپ اتقی کی تاویل کرتے وقت ایک بہت بڑی غفلت سے بھی دوچار ہوئے ہیں، وہ یہ کہ "اتقی" کو رب تعالیٰ نے عام نہیں رکھا ہے بلکہ اسے ﴿الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّى﴾ کی صفت سے خاص کیا ہے۔ (جو اپنا مال ستھرا ہونے کو راہ خدا میں دے) اسی طرح "اشقی" کی صفت کو بھی آپ بھول گئے یعنی ﴿الَّذِي كَذَّبَ وَتَوَلَّى﴾ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دونوں آیتوں میں "اتقی" اور "اشقی" کو مطلق نہ رکھا بلکہ ان کو خاص کردیا۔ اب یہ بتاؤ کہ جب "اتقی" کے معنی تقی مومن ہیں اور کوئی تقی فقیر ہے جس کے پاس مال ہی نہیں تو کیا وہ دوزخ کی آگ سے دور رکھا جائے گا؟، جواب یہ ہے کہ بے شک وہ دور رہے گا۔ اب غور کرو کہ اگر کلام بطور حصر مان لیا جائے جیسا کہ آپ لوگوں کا گمان ہے تو حصر تو اب بھی درست نہیں ہوسکا کہ تقی فقیر بے مال بھی دوزخ کی آگ سے دور رکھا گیا۔ اور اگر تاویل کی بنیاد حصر پر نہیں، تو یہ بتاؤ کہ ظاہر قرآن کے خلاف معنی مراد لینے اور تاویل کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی۔ اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ سارے تکلفات چھوڑ کر دونوں لفظوں "اتقی واشقی" اور خاص طور پر "اتقی" کو تصرف وتغیر سے محفوظ رکھا جائے، اس لیے کہ ایک آیت میں تاویل کی حاجت نہیں، یعنی "اتقی" والی میں۔ اور دوسری "اشقی" والی آیت میں ضرورت ہے مگر وہ اعتراض سے مامون ومحفوظ طریقے سے دفع

ہوجاتی ہے، جیسا کہ قاضی امام ابوبکر کی ذکر کردہ دونوں وجہوں سے یہ بات بخوبی معلوم ہو چکی۔ اس کے ساتھ یہ بھی خیال رہے کہ ہم نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ لوگ تاویل کرتے ہیں مگر بے فائدہ ہوتی ہے، اور کلام کو مراد کے تابع کرنے کی کوشش ہوتی ہے مگر وہ تابع نہیں ہوتا۔

علاوہ ازیں مجھے یہ بات بھی محسوس ہوتی ہے کہ ہوسکتا ہے بحث وتکرار ایسی بھڑکتی آگ پر انگیختہ کرے جو دلوں پر چڑھ جائے اور کوئی کھڑا ہو کر کہنے لگے کہ قاضی ابوبکر کی ذکر کردہ دونوں وجہوں پر بھی کچھ غبار ہے، لہذا ضروری ہے کہ حتی الامکان دلائل کو مستحکم کیا جائے اور موقف کو خوب واضح کر دیا جائے۔

فأقول: ور بي وليّ الاحسان.

پہلی وجہ پر یہ کلام ہوسکتا ہے کہ اتقی کا یہ وصف بیان کرنا کہ وہ بڑی آگ سے دور رکھا جائے گا، مستبعد اور دور کی بات ہے؛ اس لیے کہ کوئی ایسا شخص جو اپنی قوم میں بزرگ ترین ہو اس کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ رذیل ترین نہیں، اس جملہ میں کوئی خوبصورتی نہیں۔

اقول: اس اعتراض کو دفع کرنے کے لیے کلام میں صنعت استخدام مانی جاسکتی ہے جو فصحا کے کلام میں شائع وذائع ہے، بلکہ علمائے کرام نے توریہ اور استخدام کو علم بدیع کی سب سے عمدہ قسم شمار کیا، حتی کہ بعض علما تو بدیع کی تمام اقسام پر اس کو فوقیت دیتے ہیں جیسا کہ علامہ سیوطی نے اس کو ذکر فرمایا۔

اسی قبیل سے قرآن عظیم کا یہ فرمان ہے: ﴿ولقد خلقنا الانسانَ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِيْنٍ﴾ (اور بے شک ہم نے آدمی کو چنی ہوئی مٹی سے بنایا پھر اسے پانی کی بوند کیا ایک مضبوط ٹھہراؤ میں) اس آیت میں انسان سے مراد، ہم سب کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں۔ اور ''ہ'' ضمیر سے مراد ان کی اولاد ہے۔

اسی کے مثل یہ آیت ہے: ﴿أتىٰ امْرُ اللهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ﴾ (اللہ تعالیٰ کا حکم آگیا تو تم اس کی جلدی نہ مچاؤ) اس میں ایک معنی کے لحاظ سے ''أمرُ الله'' کے معنی ومراد محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ، اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿أتىٰ امْرُ اللهِ﴾ میں ''امر الله'' سے مراد محمد

رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، اور ضمیر سے مراد قیامت کا قائم ہونا۔ اس کو امام سیوطی نے ذکر فرمایا۔ نفعنا اللّٰہ تعالیٰ بعلو مہ آمین۔

فان قلت: جب آپ نے آیت میں ذکر شدہ نار سے دوزخ کی سب سے بڑی آگ مراد لی، وہ آگ جو سب سے بڑے بد بخت کے ساتھ خاص کر دی گئی ہے، تو پھر سب لوگوں کو اس سے ڈرانے کا کیا مطلب؟

قلت: انشاء اللہ تعالیٰ، مطلب یہ ہے کہ وہ بڑا اشقی اور بد بخت جو اپنی نہایت بدبختی، بری جزا، اور سخت بلا کے جس درجہ پر پہنچا اس کا سبب وہی کفر و عناد اور اس پر اصرار اور اڑا رہنا ہے جس پر وہ تھا، تو اے لوگو، تم بھی ڈرو کہ اگر تم حق کو نہ مانو اور باطل پر جمے رہو جیسا کہ وہ بڑا بد بخت جما رہا، تو کہیں ایسا نہ ہو کہ بدبختی میں اس کے برابر ہو جاؤ اور اس جیسا عذاب پاؤ، تو آیت مذکورہ اس آیت کی طرح ہے: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا ، فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صَاعِقَةً مِّثْلَ صَاعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ (پھر اگر وہ منہ پھیریں تو تم فرماؤ کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں ایک کڑک سے جیسی کڑک عاد اور ثمود پر آئی تھی)۔

تو قوم عاد و ثمود پر جو مصیبت نازل ہوئی وہ اسی اعراض اور روگردانی کے سبب تھی، تو کیا تمہیں اس بات کا خوف نہیں کہ اگر تم ان کے طریقہ پر چلے تو ان کی طرح عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ یا مطلب یہ ہے کہ سب لوگ اس بات کو سن کر متنبہ ہو جائیں: وہ یہ کہ آخر میں اللہ تعالیٰ کا ایک دشمن نہایت بد بخت ہوگا اور اس کے لیے نہایت بدترین سزا ہے، اور حال یہ ہے کہ لوگ اس کو نہیں جانتے کہ وہ کون ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی صفات میں سے صرف دو صفتیں بیان فرمائیں کہ وہ جھٹلائے گا اور منہ موڑے گا۔ لہذا اب ہونا یہ چاہیے کہ ہر جھٹلانے والے کا دل کٹ جائے اور ہر منہ موڑنے والے کا کلیجہ پھٹ جائے اس خوف سے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہی سب سے بڑا بد بخت نکلے جس کے لیے یہ سزا سنائی گئی ہے۔ لہذا یہ انذار وتخویف ان سب لوگوں کے لیے ہے جو جھٹلانے اور اعراض کرنے والے ہیں۔ اس نکتہ کو خوب یاد رکھنا۔ یہ بادشاہ علیم فتاح جل جلالہ کی توفیق سے بہت ہی عمدہ نکتہ ہے جو دل میں آیا۔

قاضی ابو بکر کی دوسری وجہ (حصر ادعائی) میں بھی یہ تقریر بعض اعتبار سے جاری ہو سکتی

ہے، لیکن یہاں ایک پوشیدہ نکتہ ہے، وہ یہ کہ قاضی ابو بکر نے دوسری وجہ میں حصر ادعائی کا جو قول فرمایا، تو اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ایسا حصر ادعائی موقع کے مناسب اسی وقت ہوگا جب کلام کے انداز سے یہ بات واضح ہو کہ یہ کلام اسی بڑے بد بخت اور قابل ملامت کی مذمت کے لیے وارد ہے۔ تو گویا یوں فرمایا گیا کہ وہ شقاوت کے اس درجے کو پہنچ چکا ہے جس کے سامنے ساری شقاوتیں ہیچ ہیں تو گویا دوزخ میں اس کے سوا کوئی نہ جائے گا، مگر جب یہ کلام تمام کافروں کو ڈرانے کے لیے ہو یا سب کو ڈرانے کے ساتھ اشقی کی مذمت بھی مقصود ہو تو شاید عذاب کو صرف ایک شخص میں منحصر کرنا واقعۃً اچھا نہ سمجھا جائے گا۔ غور کرو کہ یہ مقام غور وفکر ہے، اسی لیے یہ بندۂ ناتواں خود کو دوسری وجہ کے مقابلہ میں پہلی وجہ کی طرف زیادہ مائل پاتا ہے۔ یہی حصول مقصد کے لیے کافی اور اسی میں دوسری تفصیلات سے بے نیازی ہے۔ والحمد للّٰہ معطی الأمانی۔

میں جب اس مقام پر پہنچا تو میں نے اپنے بعض اعزہ سے تفسیر عزیزی عاریۃً لے کر مطالعہ کی تو میں نے دیکھا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب (تجاوز اللہ تعالیٰ عنا وعنہ) اس استبعاد پر متنبہ ہوئے جس کو میں نے قاضی ابو بکر کی دو وجہوں میں سے پہلی وجہ میں ذکر کیا تھا، اور ان کو اس پر متنبہ ہونا ہی چاہیے تھا، اس لیے کہ وہ ذکاوت وفطانت کے پہاڑ ہیں، پھر اس کا جواب انھوں نے دو وجہوں سے دیا۔

وجہ اول: ہمارے اسی قول کے قریب قریب (۱) ہے جس کی طرف توفیق الٰہی نے ہماری رہنمائی فرمائی، یعنی استخدام۔

وجہ ثانی: ”اس نار سے دور رکھا جانا جو کافروں کے ساتھ خاص ہے“ اس میں بہت وسعت ہے، اس کی آخری حد ”اتقی“ کے لیے خاص ہے، رہے باقی مسلمان تو اگرچہ وہ بھی

---

(۱) ”متقارب“ یعنی قریب اس لیے کہا کہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کا مسلک اس مقام پر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان ”تلظی“ میں تخصیص کرنا اس بات کے پیش نظر ہے جو ہم نے اس سے پہلے ذکر کی کہ ”تلظی“ کلی مشکک ہے تو اس سے ایک نوع عظیم مراد ہے، پھر ”سیجنبها“ میں ضمیر ”ها“ مطلق موصوف کی طرف راجع قرار دی جو صفت سے مجرد ہے، لہٰذا یہ باب استخدام سے نہ ہوا۔ ۱۲ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس آگ سے دور رہیں گے۔ لیکن اس کی طرح نہیں۔

اقول: عمدہ تو پہلی ہی وجہ ہے، اور میرے نزدیک وہی معتمد ہے، اور وہ جو دوسری وجہ ذکر فرمائی وہ میرے نزدیک کچھ نہیں۔ اگر چہ یہ دوسری ہی ان کو پسند ہے، کیونکہ وجہ اول کو ایسے صیغہ سے تعبیر فرمایا جس سے اس کے ضعف کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ میرے نزدیک دوسری وجہ کے درست نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ نار دوزخ سے دور رکھنے میں بہت وسعت کا مطلب یہ ہے کہ ''تجنیب'' (دور رکھا جانا) کلی مشکک ہے، تو اس کا کلی مشکک ہونا مطلق نار میں تو مسلم ہے جس میں بعض مومنین کا دخول ممکن مانا گیا ہے۔ اور اس میں وسعت کا مطلب جیسا کہ میں نے سمجھا یہ ہے کہ گناہوں کا مقتضائے اصلی۔ بایں معنی کہ جب محض گناہوں کی طبیعت وحقیقت پر نظر رہے تو وہ اسی کا تقاضا کریں۔ یہی ہے کہ بندہ کو وہ سزا ملے جس کی اسے گناہوں پر وعید سنائی گئی۔ ھذا ظاھر جدا۔

لہذا ہر وہ شخص جس نے ایک بار بھی گناہ کیا وہ اپنے اس گناہ کے سبب اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ عزوجل اس کی گرفت فرمائے۔

اور بندہ کی بکثرت نیکیاں خدائے غالب ومقتدر کے لیے گرفت سے مانع نہیں ہو سکتیں، اس لیے کہ نیکیوں کا نفع تو بندہ کو ہی پہنچتا ہے، تو اس بندہ کو کیا حق کہ اپنے نفع کے لیے کیے ہوئے کام کا اللہ تعالیٰ پر احسان جتائے، اور اللہ تعالیٰ کے دستور سزا کو بالکل بے کار وبے اثر کرنے کا ذریعہ بنائے، حالانکہ بندہ کو خوب واضح طور پر بتا دیا گیا کہ جیسا تو کرے گا ویسا تجھے بدلہ دیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ مقدار اور کیفیت کے اعتبار سے دنیا وآخرت میں بندہ کے ٹھہرنے کی مدت کو اس کے نیک وبد اعمال میں ٹھہرنے کی مقدار پر تقسیم کیا جائے تو ممکن ہے کہ اس کو آگ میں اتنے دن رہنا پڑے جو اس کے اعمال بد کے برابر ہو۔

ہم اہل سنت وجماعت (رزقنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ حظ الرحمۃ والشفاعۃ) کا عقیدہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو حق ہے کہ وہ بندہ کے ہر گناہ پر مؤاخذہ فرمائے اگر چہ وہ صغیرہ ہو، اسی طرح اس کو سزاوار ہے کہ ہر گناہ سے درگذر فرمائے خواہ وہ کبیرہ ہو۔ یہ اس کا فضل ہے، اور وہ اس کا عدل ہے، اور اللہ تعالیٰ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔

پھر یہ بھی ہے کہ مولیٰ جل وعلا نے اپنے نہایت عدل سے عمل کا بدلہ عمل کے مثل اور برابر رکھا، اسی لیے مومنین پر جنت میں انعام اور کافروں پر دوزخ میں عذاب ہمیشہ رہے گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کی نیت اور پوشیدہ ارادہ کا علم ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی حالت کفر وایمان پر قائم ودائم رہنے کا عزم رکھتے تھے یہاں تک کہ اگر دنیا میں ہمیشہ رہتے تو اپنے حال پر ہمیشہ رہتے۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے۔

﴿وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عنهُ﴾ (اور اگر واپس بھیجے جائیں تو پھر وہی کریں جس سے منع کیے گئے تھے)

یہی وجہ تو ہے کہ جب ابو طالب اپنے پورے جسم کے ساتھ کفار سے جدا رہے مگر قدم انھیں کی خبیث ملت پر جمائے رہے تو جزا دینے والے رب سبحانہ وتعالیٰ نے ان کے سارے بدن کو نار دوزخ سے نجات دی اور عذاب کو ان کے قدموں پر مسلط فرما دیا۔ جیسا کہ بخاری ومسلم وغیرہما کی حدیث میں ہے، تو اب عمل وجزا کی یکسانیت کا تقاضا تو یہ ہے کہ جس کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں اس کا عذاب میں رہنا ثواب کے گھر میں رہنے کے برابر ہو، جو ایک گناہ کرے اس کا عذاب اسے چکھایا جائے، اور جو گناہ کے قریب جائے پھر رک جائے تو عمل کے مشابہ اس کا بدلہ یہ ہے کہ اس کو نار کے قریب لے جایا جائے پھر اس سے دور رکھا جائے تا کہ غم اور گھبراہٹ کا مزہ قرب گناہ کی لذت کے برابر چکھے، یہ حکم عدل ہے، اور حکم عدل ہی اصل ہے، لیکن جود وکرم والا مولیٰ جس نے رحمت کو اپنے ذمہ کرم پر لے لیا اور از راہ فضل واحسان رحمت کو غضب پر سبقت دی، اس کی بارگاہ عالی میں دو شفیع ہیں رفعت ووجاہت والے پیارے نہ پھیرے جائیں اور نہ محروم ہوں، ایک اللہ تعالیٰ کی رحمت تمام وعام، دوسرے یہ نبی کریم جو حرم سے جود وکرم کا فیض لے کر مبعوث ہوئے۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے جمیل مہربانیوں اور جلیل رحمتوں کا وعدہ فرمایا محض اپنے فضل سے، اس لیے نہیں کہ اس پر کچھ واجب ہے، وہ اس سے منزہ وپاک ہے کہ اس پر کچھ واجب ہو، کیوں کہ وہی پناہ دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بشارت سنائی کہ ﴿إِنَّ الحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّات﴾ بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ پھر یہ انعام فرمایا کہ قرب گناہ

پر ہمیں معافی کا پروانہ دے دیا۔ ﴿ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ﴾ بے شک تمہارے رب کی مغفرت وسیع ہے۔

اور ہماری ان باتوں سے درگزر فرمایا جن کا ارادہ ہمارے نفوس کرتے ہیں جب تک کہ ان پر عمل نہ کریں اور انہیں نہ بولیں۔ اور یہ کرم فرمایا کہ جس کے دونوں پلے برابر ہوں وہ دوزخ میں نہ جائے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف بڑا سرکش نرانا فرمان ہی ہلاک ہو۔ یہ سب کچھ مولائے غنی کریم کا فضل وکرم ہے۔ اس کی نعمتیں جلیل ہیں اور احسان پے در پے ہیں۔ لہ الحمد کما یحب ویرضی۔

لہذا ہر وہ شخص جس نے گناہ کیا، یا گناہ کے پاس جا کر رک گیا۔ پھر بھی اللہ تعالیٰ نے اسے نار سے دور رکھا تو یقیناً سزائے عمل کے استحقاق کے باوجود اسے دور رکھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ رَبَّكَ لَذُو مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلَى ظُلْمِهِمْ ﴾ (بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں کو بخشنے والا ہے ان کے ظلم کے باوجود)۔ بلکہ مغفرت کے معنی ہی یہ ہیں کہ صاحب حق اپنا حق لینے کو کلی یا جزوی طور پر معاف کردے۔ لہذا واضح رہے کہ یہ ہے نار سے قریب کر کے اس کو دور رکھنا اور نار کی طرف لے جا کر اس سے بچانا۔ ہاں یہاں مراتب کا فرق بھی ہے، کما لا یخفی۔

مگر وہ جو تقویٰ کی آخری منزل کو پہنچ گیا یہاں تک کہ ہر نا پسندیدہ بات سے دور رہا، اور خلق سے فانی اور حق کے ساتھ باقی ہو گیا۔ اور اس کی شان معصیت کے ارتکاب اور رحمٰن کی مبغوض چیزوں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے سے بھی بلند و بالا ہو گئی تو محال ہے کہ ایسے شخص کو نار دوزخ سے علاقہ ہو۔ یا نار کو اس سے کوئی تعلق ہو، خصوصاً وہ جو سارے متقیوں سے بڑھ کر متقی ہے اور تمام اصفیا سے زیادہ صاف باطن، جس کے تمام احوال پر حق کی چشم رضا رہی، اور حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو جس کا کوئی کام برا نہ لگا، تو یہی وہ خدا کا بندہ ہے اور یہی وہ خاص بندہ ہے کہ زبانیں اس کے کمال کو بیان کرنے سے عاجز ہیں، اور عقلیں اس کی عظمت کے میدان میں گم ہیں، عقلیں اس میدان میں دوڑیں، گھومی پھریں، گر پڑیں، پھر لوٹیں تو ان سے پوچھا گیا تو بولیں، وہ وہی ہے۔

لہذا اس خاص بندے کے بارے میں آخری بات یہی ہے کہ وہ سارے بندوں سے

اولیٰ اور خدائے جواد کے اس قول کی پہلی مراد ہے، فرماتا ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَت لَهُم مِّنَّا الحُسنىٰ ، أُولَئِكَ عَنهَا مُبعَدُونَ ، لَا يَسمَعُونَ حَسِيسَهَا ، وَهُم فِي مَا اشتَهَت أَنفُسُهُم خٰلِدُونَ ، لَا يَحزُنُهُمُ الفَزَعُ الأَكبَرُ ، وَ تَتَلَقّٰهُمُ المَلٰئِكَةُ ، هٰذَا يَومُكُمُ الَّذِي كُنتُم تُوعَدُونَ﴾

بے شک وہ جن کے لیے ہمارا وعدہ بھلائی کا ہو چکا وہ جہنم سے دور رکھے گئے ہیں، وہ اس کی بھنک نہ سنیں گے، اور وہ اپنی من مانی خواہشوں میں ہمیشہ رہیں گے، انہیں غم میں نہ ڈالے گی وہ سب سے بڑی گھبراہٹ، اور فرشتے ان کی پیشوائی کو آئیں گے کہ یہ ہے تمہارا وہ دن جس کا تم سے وعدہ تھا۔

حسب طاقت بیان، یہ مطلب ہے مطلق نار سے دور رکھنے میں بڑی وسعت کا۔ مگر وہ آگ جو کفار کے ساتھ خاص ہے اس کے بارے میں یہ بات نہیں بنتی، اس لیے کہ وہ تو کفر کی سزا ہے، اور سب مومن اس نار سے دور رہنے میں برابر ہیں، کیوں کہ کفر و ایمان بڑھتے گھٹتے نہیں۔ اس عقیدے پر اجماع مسلمین ہے، اور جو اختلاف بیان کیا جاتا ہے وہ لفظی ہے۔ لہذا ضروری ہے کہ مسلمان کفر کی سزا سے دور رہنے میں بھی برابر ہوں۔

لیکن یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿هُم لِلكُفرِ يَومَئِذٍ أَقرَبُ مِنهُم لِلإِيمَانِ﴾ اس دن وہ ظاہری ایمان کی بہ نسبت کھلے کفر سے زیادہ قریب ہیں، (یہ فرمان اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کفر و ایمان میں کمی زیادتی ہوتی ہے، کہ کوئی کفر سے زیادہ قریب ہے ایمان کے مقابلہ میں اور ایمان سے دور۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ صرف ظاہر کے اعتبار سے ہے، کیوں آیت منافقین کے احوال بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی، اس لیے کہ اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا: ﴿يَقُولُونَ بِأَفوَاهِهِم مَا لَيسَ فِي قُلُوبِهِم ، وَاللّٰهُ أَعلَمُ بِمَا كَانُوا يَكتُمُونَ﴾ اپنے منہ سے کہتے ہیں جو ان کے دل میں نہیں، اور اللہ کو معلوم ہے جو چھپا رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ منافقین ظاہر میں ایمان والے بنتے تھے، لہذا جو ان کے دلوں کے بھید نہیں جانتے تھے وہ تو ان کو مومن سمجھتے تھے، اس لیے کہ یہ لوگ کفر سے دوری ظاہر کرتے

تھے، پھر جب جنگ احد کے لیے جاتے وقت یہ مسلمانوں کے لشکر سے جدا ہو گئے اور بولے: ﴿لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ﴾ اگر ہم لڑائی ہوتی جانتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ ان کے اس قول سے ان کا پردہ فاش ہو گیا اور مسلمانوں کو غالب گمان ہو گیا کہ یہ مسلمان نہیں، البتہ ایک احتمال یہ باقی تھا کہ ہوسکتا ہے یہ لوگ اس لیے ایسا کہہ رہے ہیں کہ بزدلی و کاہلی کے سبب یا راحت پسندی کے سبب جنگ میں شرکت کرنا نہیں چاہتے، تو کفر و ایمان سے قرب و بعد کا یہ مطلب ہے۔

یا یہاں کفر و ایمان سے مراد کفر والے اور ایمان والے ہوں [تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ اہل ایمان کی بہ نسبت اہل کفر سے زیادہ قریب ہیں]، اس لیے کہ جنگ کے راستہ سے منافقوں کا واپس چلے آنا مسلمانوں کی جماعت کو کم کرنا ہے، اور مسلمانوں کی جماعت میں کمی پیدا کرنا مشرکوں کو قوت دینا ہے۔ مفسرین نے اسی طرح بیان فرمایا ہے۔ ھذا ما عندی واللہ سبحانہ و تعالیٰ اعلم۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تحقیق کی ہوائیں اس بات پر چلیں کہ عمدہ صورت یہی ہے کہ یہاں دونوں لفظوں (اتقی و اشقی) کو ان کے ظاہر پر رکھا جائے، البتہ دو چیزوں کی ضرورت پیش آئے گی اور ان کو اختیار کرنے میں نہ کوئی تکلف ہے اور نہ معنی کلام میں کوئی تغیر و تبدل۔

اول: یہ کہ یہاں "نَارًا" کی تنکیر تعظیم کے لیے ہے، جیسا کہ تم کلام فصیح قرآن و حدیث اور قدیم و جدید میں اس کا استعمال بکثرت دیکھتے ہو، یا تلظی جو مطلق ہے، اس کو فرد کامل پر محمول کرتے ہوئے سخت ترین بھڑکنے کے معنی میں لیا جائے۔ اور یہ بھی خوب رائج و عام ہے۔

دوم: استخدام، اس کے بارے میں تم سن چکے کہ یہ علم بدیع کی اعلیٰ صنعت، یا اعلیٰ انواع بدیع سے ہے۔ یا ضمیر کا مرجع فقط موصوف ہے، اس میں صفت کا لحاظ نہیں۔ لیکن اس بات کا تاویل سے کوئی تعلق نہیں، علاوہ ازیں ہمارا مقصود تو آیت اتقی ہے، اور اس میں قطعاً یقیناً تاویل کی گنجائش نہیں۔ ھکذا ینبغی التحقیق واللہ ولی التوفیق والحمد للہ رب العالمین۔

جب تم نے ان تمام چیزوں کو ضبط کر لیا اور اچھی طرح سمجھ لیا، اب اگر تمہاری پوری

توجہ ہے اور تم ذہین و فطین ہو تو تمہارے لیے پہلے شبہہ (یعنی ''اتقی'' بمعنی ''تقی'' ہونے) کا جواب چند طرح سے دینا آسان ہے۔

وجہ اول: یہ ہے کہ ظاہر لفظ کا تحفظ ضروری ہے، یعنی لفظ کو ظاہر سے بلا ضرورت پھیر نا جائز نہیں، اور یہاں ضرورت کہاں۔

وجہ دوم: جس تاویل کی طرف لوگ مائل ہوئے اس سے تو خرابی میں اور اضافہ ہی ہوا۔ لہذا ہم پر لازم ہے کہ اس سے پہلو تہی کریں۔

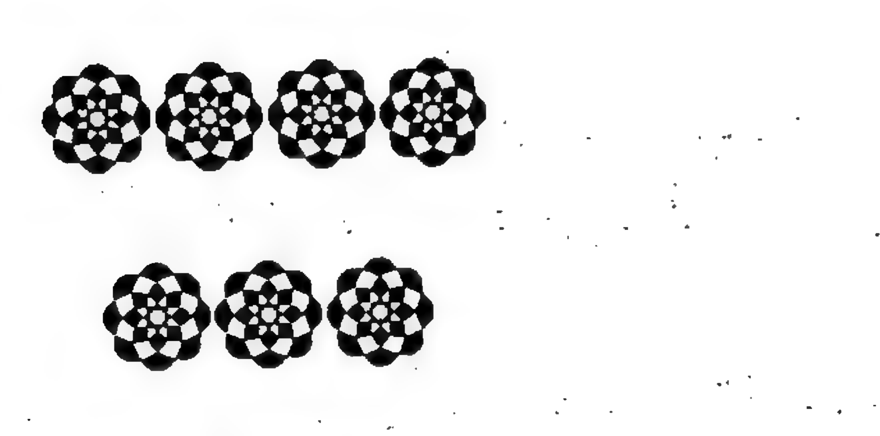
اس مقام پر ابو عبیدہ نے جس طرح مشقت مول لی اور پاپڑ بیلے، اس کاوش میں نہ وہ صواب کو پہنچا اور نہ کوئی مفید بات کہی، لہذا ہم اللہ تعالیٰ کے فرمان کے ظاہری معنی اس ایک شخص کے کہنے سے کیسے چھوڑ دیں جو نہ صحابی ہے اور نہ تابعی، بلکہ نہ سنی ہے اور نہ اپنے مطلب و مقصد میں صواب اور صحیح نتیجہ کو حاصل کرنے والا، اور نہ اپنی جائے فرار میں کوئی نفع کمانے والا۔

اے لوگو! میں تم سے ایک بات پوچھوں تو کیا تم جواب دو گے، بھلا بتاؤ اگر آیت کریمہ لفظ ''تقی'' کے ساتھ وارد ہوتی، اور ابو عبیدہ جیسا زبان داں اس کی تفسیر ''اتقی'' سے کرتا اور بتاتا کہ یہاں ''تقی'' بمعنی ''اتقی'' ہے۔ اس وقت ہم اس کے قول کو اختیار کرکے تمہیں اس بات کے قبول کرنے کی دعوت دیتے۔ تو اس وقت آپ لوگ کیا کرتے؟ [کیا یہ مان لیتے کہ تقی بمعنی اتقی ہے اور اس کے مصداق حضرت صدیق ہیں یا ہو سکتے ہیں؟ ہر گز نہیں] بات دراصل یہ ہے کہ انصاف بڑی نادر و نایاب چیز ہے اور اسی کو ملتی ہے جو بڑا نصیبہ ور ہے۔

وجہ سوم: ہم نے مان لیا کہ آیت میں ایک معنی یہ بھی ہے لیکن ایسا تو نہیں کہ صرف یہی ایک معنی ہے۔ بلکہ ہم نے جو معنی بیان کیے وہی زیادہ واضح اور ظاہر ہیں، اور ''اتقی'' و ''تقی'' کی نجات میں بھی کوئی تنافی اور جدائی نہیں، حالانکہ قرآن کریم اپنی ہر تاویل و توجیہ پر حجت ہے۔ پھر اس بات پر بھی نظر رہے کہ ایک وجہ کے اعتبار سے تفضیل کا ثبوت ہو رہا ہے اور دوسری اس کے منافی نہیں، تو اسے قبول کرنا لازم اور اس کا قائل ہونا ضروری۔

اسی لیے تم دیکھتے ہو کہ ہمارے علمائے کرام رحمہم اللہ تعالیٰ اس آیت سے سیدنا عتیق

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت پر ہمیشہ دلیل لاتے رہے حالانکہ وہ حضرات ابو عبیدہ وغیرہ کے کلام کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ان تمام توجیہات وتاویلات نے ان کو اپنے موقف ومسلک سے نہ روکا اور نہ کسی نے ان کی اس روش کو ناپسند قرار دیا۔اب ثابت ہو گیا کہ بحمد اللہ تعالیٰ ہمارا مقصد حاصل،اور تمہارا گمان اللہ تعالیٰ کی قدرت سے باطل۔ والحمد للہ رب العالمین ایاہ نرجو وبہ نستعین۔



باب دوم

شبہہ ثانیہ:

یہ شبہہ مولیٰ فاضل استاذ استاذی شاہ عبدالعزیز بن ولی اللہ دہلوی۔(سا محنا اللہ وایا ھما بلطفہ الخفی وفضلہ الوفی)۔ نے تفسیر ''فتح العزیز'' میں نقل فرمایا۔اس سے پہلے آپ نے آیت کریمہ سے اہل سنت وجماعت کا استدلال مشہور ومعروف ذکر فرمایا۔ پھر لکھا:
تفضیلیہ کا کہنا ہے کہ ''اتقی'' بمعنی ''تقی'' ہے، اور یہ صیغہ اسم تفضیل اپنے معنی سے خالی ہے، اس لیے کہ اگر یہ معنی تفضیل سے خالی نہ ہوتو اپنے اطلاق کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی شامل ہوگا اور سرکار پر بھی صدیق اکبر کی فضیلت لازم ہوگی اور یہ قطعاً اجماعاً باطل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے فرمایا: اہل سنت وجماعت کی طرف سے جواب یہ ہے کہ ''اتقی'' کو ''تقی'' کے معنی میں لینا عربی زبان کے خلاف ہے اور قرآن کریم تو اسی زبان میں اترا، لہذا کسی آیت کو ایسے معنی پر محمول کرنا جو عربی زبان میں نہ ہو صحیح نہیں۔ اور تفضیلیہ نے یہاں جو ضرورت پیش کی وہ یوں دفع ہوجاتی ہے کہ بات انبیائے عظام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی مقدس جماعت کے علاوہ میں ہو رہی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت مطہرہ سے یہ بات معلوم ومشہور ہے کہ انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سب سے عظمت والے ہیں اور ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے، لہذا انہیں باقی لوگوں پر قیاس نہ کیا جائے گا اور نہ باقی لوگ ان پر قیاس کیے جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب لوگوں کی باہمی فضیلت اور درجات کے تفاوت کی بات ہو رہی ہو اس وقت شریعت کا عرف اس طرح کے کلام کو امت کے ساتھ خاص کردیتا ہے، اور تخصیص عرفی، تخصیص ذکری سے زیادہ قوی ہے۔ جیسے کوئی کہے: گیہوں کی روٹی سب سے اچھی ہے، اس سے نہ سمجھا جائے گا کہ گیہوں کی روٹی کو بادام کی روٹی پر بھی فضیلت حاصل ہے، اس لیے کہ اس کا استعمال متعارف نہیں، اور وہ مبحث سے خارج ہے، کیوں کہ بات میوے کی روٹی کی نہیں بلکہ غلہ کی روٹی کی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کا یہ کلام تفسیر فارسی میں تھا۔ ہم نے عربی میں اس کا مفہوم بیان کیا ہے۔

أقول وبالله التوفيق: حضرت شاہ صاحب نے یہ بات جو ذکر کی کہ ''اتقی'' کا بمعنیٰ ''تقی'' ہونا عربی زبان کے استعمال کے خلاف ہے، تو یہ ممنوع اور مدفوع ہے۔ کیا تم اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو نہیں دیکھتے۔ (هُوَ الَّذِي يَبدَؤُ الخَلقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ وَهُوَ اَهوَنُ عَلَيهِ) اور وہی ہے کہ اول بناتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور یہ اس پر زیادہ آسان، یعنی آسان ہے۔ یہاں ''اھون'' ''اسم تفضیل بمعنیٰ'' ھیِّن ''ہے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی چیز دوسری چیز سے زیادہ آسان نہیں، وہ ہر چیز پر یکساں قادر ہے، یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوبارہ بنانا تمہاری نظر میں زیادہ آسان ہونا چاہیے۔ دوسرا مطلب جو ہم نے بیان کیا وہ اسی تاویل کی قبیل سے ہے جو قرآن میں وارد ''عسیٰ'' اور ''لعل'' سے متعلق تاویلات میں ذکر کی جاتی ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے جس میں اسم تفضیل اپنے حقیقی معنی پر نہیں، ﴿أَصحَابُ الْجَنَّةِ يَوْمَئِذٍ خَيرٌ مُّسْتَقَرًّا وَأَحْسَنُ مَقِيلًا﴾ جنت والوں کا اس دن اچھا ٹھکانا، اور حساب کی دوپہر کے بعد اچھی آرام کی جگہ۔ [یہاں خیر اور أحسن اسم تفضیل بہتر اور زیادہ اچھے کے معنی میں نہیں]

اس لیے کہ جنتیوں کے سوا دوسروں کے لیے کوئی خیر نہیں اور خسارہ والوں کے لیے کوئی اچھی جگہ نہیں۔ یا یہ آیت کفار سے استہزا کے طور پر جاری ہوئی، جیسا کہ مفسرین نے فرمایا۔

ان سب کے باوجود اصل بات یہ ہے کہ اسم تفضیل کا حقیقی معنی تفضیل ہی ہے اور اس معنی سے اسی وقت خالی کیا جائے گا، (۱) جب کوئی ضرورت داعی ہو اور قرینہ قائم ہو جیسا کہ

---

(۱) أقول: عجیب معاملہ ہے، ایک طرف تو یہ خیال ہے کہ تخصیص سے مفر نہیں، دوسری طرف یہ فیصلہ کہ اسم تفضیل کا صیغہ ''أفعل'' یکسر تفضیل ہی سے خالی ہے۔۔ جب کہ تخصیص سے صرف وہ خارج ہوتا ہے جس کے خارج ہونے پر دلیل قائم ہوئی۔ پھر باقی کے حق میں عام اپنے عموم پر برقرار رہتا ہے۔ یہی حق ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو عمومات قرآن میں سے کسی سے استدلال روا نہ ہو۔ إلا ماشاء الله۔ اس لیے کہ اکثر عمومات تخصیص یافتہ ہیں، یہاں تک کہ کہا گیا: کوئی عام ایسا نہیں جس سے بعض کی تخصیص نہ ہوئی ہو۔ فقیر نے یہ (تخصیص والا) جواب پسند نہ کیا، اس لیے کہ آیت اس صورت میں ظنی ہو جائے گی۔ اور یہ ہمارے مسلک کے خلاف ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ ۱۲ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

گزشتہ دونوں آیتوں میں ہم نے اس کی وضاحت کی، اور جہاں نہ ضرورت ہو اور نہ کوئی قرینہ جیسے آیت ''انقی'' میں۔ تو پھر ہم معنی تفضیل سے خالی ہونے کی بات نہیں کہہ سکتے، اگر ایسا کسی نے کہا تو اسے تفسیر کے بجائے تحریف قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا، جیسا کہ ہم پہلے اس کی تحقیق کر آئے۔ یہاں تفضیلیہ کے رد کے لیے اتنی ہی بات کافی ہے۔

یہاں شاہ صاحب نے جو تخصیص عرفی کی بات کی، یہ بر تقدیر تسلیم دعوائے خصم ہے۔ فریق مقابل نے کہا کہ اس تفضیل کا صیغہ اپنے عموم کی وجہ سے انبیا علیہم الصلاۃ والسلام کو بھی شامل ہوگا۔ اس دعوے کو مان کر تخصیص عرفی سے جواب دیا ہے۔

اور اگر تم حق اور مستحکم بات چاہو تو یہ ہے کہ نہ یہاں عموم وشمول ہے جو تفضیلیہ کہتے ہیں، اور نہ تخصیص (جو شاہ صاحب نے ذکر کی)، اس لیے کہ ''اتقی'' اگر عام ہے تو اپنے افراد کو عام اور شامل ہے، اور اس کے افراد وہ ہیں جن کو فضیلت اور ترجیح دی گئی، وہ نہیں جو مرجوح ہیں یعنی جن پر فضیلت دی گئی۔

اللہ رب العزت ملک العلام کی توفیق سے اس مقام کا راز یہ ہے کہ افضل کے لیے ایک مفضل اور دوسرا مفضل علیہ ضروری ہے۔ اور اسم تفضیل جب اضافت یا ''مِن'' کے ساتھ استعمال ہو تو مفضل علیہ صراحۃً مذکور ہوتا ہے، مگر جب اسم تفضیل کا استعمال الف لام کے ساتھ ہو تو اس وقت مفضل علیہ کلام میں مذکور نہیں ہوتا، لیکن یہ الف لام اس کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وہ مفضل علیہ مفضل کی جانب اشارہ کے ضمن میں معہود و متعین ہوتا ہے، اس لیے کہ کوئی ذات جس کو دوسرے پر فضیلت ہو جیسا کہ الف لام سے خالی صیغۂ اسم تفضیل ''اَفْعَلُ'' کا مفاد ہے اسی وقت متعین ہوگی جب مفضل علیہ متعین ہو، لہذا مفضل کی تعیین مفضل علیہ کی تعیین کو مستلزم، اور جب تعیین صراحۃً موجود نہیں تو آخر کار حکماً تعیین ماننی ضروری ہوگی، اب غور کرو کہ شریعت مطہرہ میں بعض امتیوں کی تفضیل دوسرے بعض پر تو معہود وموجود ہے، مگر بعض امت کی حضرات انبیا علیہم الصلاۃ والسلام پر تفضیل شریعت میں کہیں بھی معہود وموجود نہیں، لہذا امتی کی انبیا پر تفضیل نہ متکلم کا مقصود ہوگی نہ سامع کو مفہوم ہوگی، تو انبیائے کرام ایسے مقام پر لفظ میں داخل ہی نہ ہوں گے کہ تخصیص کر کے خارج کرنے کی ضرروت درپیش ہو۔ تأمل انه دقیق۔

میں اپنی نظر وفکر سے اس نتیجہ پر پہنچا تھا یہاں تک کہ میں نے علمائے نحو کی تصریح اس کے مطابق دیکھی۔ وللہ الحمد۔

حضرت بلند مرتبت نور الملۃ والدین علامہ جامی قدس سرہ السامی نے فرمایا: اسم تفضیل کی وضع ایک شی کی دوسرے پر فضیلت بتانے کے لیے ہے، لہذا اس میں ضروری ہے کہ اس دوسرے کا ذکر بھی ہو جو مفضل علیہ ہے، ''من اور اضافت کے طریقہ پر استعمال میں تو مفضل علیہ کا مذکور ہونا ظاہر ہے، مگر الف لام کے ساتھ استعمال کی صورت میں مفضل علیہ ظاہراً مذکور کے حکم میں ہے، اس لیے کہ لام تعریف سے ایک معین کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو مفضل علیہ کی تعیین کی وجہ سے متعین، اور لفظاً یا حکماً پہلے مذکور ہوتا ہے، جیسے زید سے افضل کوئی شخص مطلوب ہو تو تم کہو گے: ''عمرو الافضل ''یعنی وہ شخص جس کو ہم نے زید سے افضل کہا وہ عمرو ہے، خلاصہ یہ ہوا کہ ''افعل ''اسم تفضیل میں جو لام ہے وہ تعیین ہی کے لیے ہوگا۔ انتہی

قلت: اس مقام کی پوری تحقیق کر کے مقصد کی تنقیح تفصیل چاہتی ہے، لیکن ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔

دو لطیفے: جس طرح اسم تفضیل کے بارے میں علامہ جامی قدس سرہ السامی نے تصریح فرمائی، ایسی ہی وضاحت رضی استر آبادی نے بھی کی ہے، یہ شخص فن نحو میں اپنے شہر اور زمانہ میں اپنی مثال آپ تھا، (اس کے شہر میں اس کے دور کی آبادی اسی جیسے لوگوں سے تھی) لیکن ہم نے اس کا کلام اس لیے نہیں نقل کیا کہ اس کے دل پر ایسی آفت چھائی ہوئی ہے جس کی کوئی حد نہیں، اس کو سمجھا جس نے سمجھا۔

اس کے بعد حضرت مولانا فاضل شاہ عبد العزیز دہلوی قدس سرہ نے بعض گرامی قدر اکابر سے ''اتقی ''کے سلسلہ میں ایک اور جواب نقل فرمایا، غالباً بعض اکابر سے ان کی مراد ان کے والد حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی ہیں۔

جواب یہ ہے کہ ''اتقی ''یہاں پر اپنے معنی میں ہے، یعنی جو تقویٰ میں اپنے ماسوا تمام افراد سے افضل ہو، خواہ نبی یا غیر نبی، مگر یہ افراد ان افراد سے خاص ہیں جو زندہ موجود ہیں، تو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی صفت ''اتقی ''سے متصف اپنی عمر کے آخری حصہ میں

خلافت کے زمانہ میں ہوئے، اس وقت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا وصال ہو چکا تھا، اور سیدنا عیسیٰ علی نبینا وعلیہ الصلوۃ والتسلیم چوں کہ آسمان پر اٹھا لیے گئے، لہٰذا وہ زندوں کے حکم میں نہیں، پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کو ''انقی'' کہا جارہا ہے وہ تمام زمانوں میں اتقی ہو، اور تمام احیاء واموات کی طرف نسبت کرتے ہوئے اتقی ہو، ورنہ کوئی بھی شخص عالم میں اتقی کا مصداق نہیں پایا جاسکتا۔

اس لیے کہ بچپن کے زمانہ میں تقویٰ کا تصور ہی نہیں، اور ہر وہ منصب جو شرعا محمود قرار پاتا ہے اس میں آخری عمر ہی کا اعتبار ہوتا ہے، جیسے عدل، صلاح، غوثیت، قطبیت، ولایت، نبوت، اسی لیے جوان اوصاف سے مشرف ہوتا ہے اسے اس کے آخری ایام میں ان صفتوں سے موصوف قرار دیتے ہیں، خواہ ان کو یہ اوصاف شروع عمر میں حاصل نہ ہوں۔ لہٰذا اتقی وہ ہے جس کو تمام موجودین میں اس کی آخری عمر میں تقویٰ میں فضیلت حاصل ہوئی ہو، یہی آخری زمانہ اعمال کے اعتبار کا زمانہ ہے۔ اس تقریر سے صدیق اکبر کی افضلیت کا دعوی بلا تکلف اور بغیر تاویل ثابت ہو رہا ہے۔ (فارسی سے عربی میں ترجمہ) یہ عبارت نقل فرما کر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کو پسند کیا، کیوں کہ وہ اس طرف مائل ہیں اور اس پر انہوں نے سکوت فرمایا ہے۔

أقول: اگر اللہ تعالیٰ ذہانت کے ساتھ پختہ قلب کی دولت سے کسی کو نوازے تو وہ محکم یقین کرے گا کہ یہ تقریر ملمع سازی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ ہم مانتے ہیں کہ حدیث ((العبرة بالخواتیم)) یعنی اعتبار خاتمہ کی بات حق اور واجب التسلیم ہے، لیکن کیا عقل سلیم اس بات پر گواہ نہیں کہ جب زندہ موجود لوگوں میں سے کسی کی کوئی صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے اس کا فی الحال متصف ہونا سمجھا جاتا ہے۔ یہ نہیں سمجھا جاتا کہ وہ آئندہ ایسا ہوگا، اور جب ذہن اسی کی طرف سبقت کرتے ہیں تو یہ (تبادر ذہنی) اس کے معنی حقیقی ہونے پر واضح دلیل ہے، اور کسی قرینہ کی حاجت جو ذہن کو دوسرے معنی کی طرف پھیرے اور مقصد کو ظاہر کرے یہ معنی مجازی کی علامت ہے، پھر ہمیں مجازی معنی کی کیا ضرورت جب کہ ہمارے طریقہ پر معنی حقیقی بلا تکلف اور بغیر تاویل درست ہیں۔ نیز شیخ عبدالعزیز قدس سرہ کے طریقہ پر بھی

حقیقی معنی درست، اس لیے کہ ایسی عرفی تخصیصات اذہان میں جاگزیں ہوتی ہیں جن کے ذکر کی حاجت نہیں ہوتی۔

اور کہتے ہیں کہ عرف عام کے اس اشارہ کی دلالت صراحت سے کم نہیں، اسی لیے اس تخصیص کے باوجود عام اپنے قطعی ہونے سے نہیں گرتا، جیسا کہ اصول فقہ کی کتابوں میں اس کی صراحت ہے۔

پھر اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب نے اس تخصیص عرفی کو تکلف وتاویل قرار دیا حالانکہ یہ قرآن وحدیث کے نصوص میں شائع ہے۔ اگر یہ تکلف کے باب سے ہو تو قرآن کریم اور احادیث رسول علیہ التحیۃ والتسلیم میں کس قدر تکلف ہوگا۔

اس سے بھی زیادہ تعجب خیز یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے پسندیدہ طریقے کو تکلف سے بری کہا جب کہ وہ بہت دور کی تاویل اور توجیہ بارد کا محتاج ہے، اس لیے کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تمام موجودہ لوگوں میں کبھی بھی سب سے زیادہ متقی نہ تھے، (اور نہ یہ ہمارا یا کسی کا دعویٰ) اس لیے کہ راجح مذہب یہ ہے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام زندہ ہیں، اور آسمان میں ہونے کی وجہ سے ان کا مردوں میں شامل ہونا یہ ایسی بات ہے جس کے وہ بس قائل ہیں، اس پر ان کے پاس کوئی دلیل وبرہان نہیں۔ اگر بالفرض یہ بات مان لی جائے تو تم سیدنا حضرت خضر علیہ السلام کے احوال سے کہاں غافل ہو، جب کہ ان کے بارے میں معتمد اور پسندیدہ قول یہ ہے کہ وہ نبی ہیں، اور اپنی دنیوی حیات مقدسہ کے ساتھ آج بھی دنیا میں موجود ہیں اسی طرح سیدنا ادریس وسیدنا الیاس علیہما السلام جیسا کہ شرح مقاصد وغیرہ میں تصریح ہے، اگر اس مقام پر یہ عذر بیان کیا جائے کہ یہ حضرات نگاہوں سے اوجھل ہونے اور شہروں سے جدا رہنے کی وجہ سے اموات سے ملحق قرار دیے گئے ہیں، تو کہا جائے گا کہ یہ عذر تو پہلے قول سے بھی زیادہ فاسد ہے۔ فافہم

اس کے علاوہ ہم نے یہ بات بھی واضح کر دی تھی کہ آئندہ حاصل ہونے والی صفت کا ابھی سے اطلاق مجازی معنی ہیں۔ اور معنی مجازی کے لیے قرینہ درکار، اور قرینہ یہ ہے کہ شرعاً یہاں انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی تخصیص ہے، (یہ قرینہ تو معنی حقیقی کی نشان دہی کر رہا

ہے) لہذا اس پر بھروسہ کرتے ہوئے حقیقی معنی مراد لینا زیادہ اچھا ہے۔ یا بعینہ اسی قرینہ پر اعتماد کر کے معنی مجازی کی طرف لے جانا زیادہ مناسب؟۔

ابھی تو یہاں گوشوں میں کچھ پوشیدہ باتیں رہ گئی ہیں جنہیں ہم ملامت کے خوف سے ترک کر رہے ہیں۔ لہذا جواب یہی حق اور صحیح ہے جو اس ناتواں بندہ نے اپنے رب جلیل کی توفیق واعانت سے عرض کیا۔

ثم اقول: میں پھر کہتا ہوں کہ اس مقام پر ایک نہایت معقول نکتہ ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کی طرف کسی کی توجہ نہ ہوئی۔ وہ یہ ہے کہ اسم تفضیل کے لیے مفضل علیہ ضروری ہے، (جو اسم تفضیل من یا اضافت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس میں تو مفضل علیہ صراحۃً مذکور ہوتا۔ جیسا کہ گزرا)۔

اب دیکھنا ہے کہ جو اسم تفضیل معرف باللام ہوتا ہے اس میں مفضل علیہ کون ہے؟ اور اس کا مفاد کیا ہے؟

(۱) اس کا مفاد یا تو ان تمام افراد پر تفضیل ہوگی جن کے درمیان اس طرح کے مقام میں تفاضل معہود ومعروف ہے، جیسے ہمارے قول "خبز البر هو الاحسن" (گیہوں کی روٹی ہی بہتر ہے) میں دوسرے اناج کی روٹیوں پر گیہوں کی روٹی کی افضلیت، اور زیر بحث مسئلہ میں امت پر حضرت صدیق اکبر کی افضلیت۔

(۲) جن افراد کے درمیان تفاضل معہود ہو ان میں سے صرف بعض پر (الافضل سے) افضلیت کا افادہ ہو بعض دیگر پر نہ ہو۔ (۱)

(۳) نہ اول متعین ہو نہ ثانی، بلکہ دونوں کا احتمال ہو۔

---

(۱) بعض سے وہ مراد ہے جو کل کے منافی ہو۔ یعنی بشرط لاشی۔ (بعض بشرط انتفائے کل) لیکن وہ بعض جس میں کوئی شرط نہ ہو۔ (اس لیے احتمال ہو کہ بعض ہی تک محدود رہے جیسے: "بعض العالم شاعر" میں۔ اور احتمال ہو کہ بقیہ بعض کو بھی شامل ہو جیسے: "بعض الانسان حیوان" میں) اور کسی جگہ کل صادق ہو اس لیے وہ بعض مطلق غیر مشروط بھی صادق ہو تو یہ تیسری شق میں داخل ہے۔ ۱۲ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

پہلی صورت میں تو ہمارا دعویٰ ثابت اور مقصد حاصل کہ ہم صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت مطلقہ کے قائل ہیں۔

دوسری صورت بداہۃً باطل، (کیونکہ ترجیح بلا مرجح ہوگی اور یہ باطل ہے) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿سبح اسم ربك الأعلى﴾ اپنے رب اعلیٰ کی پاکی بولو۔ اور نماز کے بعد حضور اقدس نے اپنے رب کی بارگاہ میں عرض کیا ﴿اسمع واستجب الله اکبر الا کبر﴾ اے رب! دعا سن لے اور قبول فرما۔ اللہ اکبر سب سے بڑا ہے، یہاں ایک روایت میں دوسرا ''اکبر'' مرفوع ہے۔ اس حدیث کو ابوداؤد، نسائی اور ابن السنی نے روایت کیا۔

مسند ابی یعلی میں بروایت حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ایک حدیث میں ہے (الله الأجود الأجود) اللہ ہی سب سے بڑھ کر جود و کرم والا ہے۔

اسی طرح وہ روایت کہ صفا و مروہ کے درمیان حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دعا کی: رب اغفر وارحم انك انت الاعز الا کرم۔ اے رب بخش دے اور مہربانی فرما، بے شک تو ہی سب سے بڑھ کر عزت والا کرم والا ہے۔ یہ روایت مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے۔ بلکہ سب سے بڑی دلیل یہ کہ خود نمازی ہر دن سجدوں میں پڑھتا ہے، "سبحان ربی الا علی"۔

(ان تمام ارشادات و اقوال میں تفضیل علی الاطلاق ہے، لہذا دوسری صورت کا قول باطل ٹھہرا)

تیسری صورت میں آیت مفضل علیہم کے حق میں مجمل ہوگی، اور مجمل کا بیان نہ آیا تو وہ متشابہات میں شمار ہوگی، حالانکہ اس آیت کو کسی نے بھی متشابہات میں شمار نہ کیا، لیکن بحمد اللہ ہم نے اس آیت کا بیان خود صاحب بیان حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پایا، وہ یہ ہے:

امام ابو عمر بن عبد البر نے بروایت مجالد امام شعبی سے تخریج کی، یہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا۔ یا۔ ان سے پوچھا گیا کہ یہ بتائیے لوگوں میں سب سے پہلے کون اسلام لایا؟ انہوں نے فرمایا: کیا تم نے حضرت حسان بن ثابت کا یہ کلام نہ سنا:

(۱) جب تجھے سچے دوست کا غم یاد آئے تو اپنے بھائی ابو بکر کو ان کے کارناموں سے یاد کر۔

(۲) جو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد ساری مخلوق سے بہتر، سب سے زیادہ تقویٰ اور عدل والے، اور سب سے زیادہ عہد کو پورا کرنے والے تھے۔

(۳) جو غار میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ثانی تھے جو ان کی تبعیت میں رہے، جب کی موجودگی محمود تھی، اور لوگوں میں جنھوں نے سب سے پہلے رسولوں کی تصدیق کی۔

ہمیں خبر دی عبد الرحمٰن نے، انھوں نے روایت لی ابن عبد اللہ مکی سے، انھوں نے عابد زبیدی مدنی سے، انھوں نے فلانی سے، انھوں نے ابن السنہ سے، انھوں نے شریف سے، انھوں نے ابن ارکماش سے، انھوں نے ابن حجر عسقلانی سے، انھوں نے کمال ابوالعباس سے، یہ کہتے ہیں کہ خبر دی ہم کو ابو محمد عبد اللہ بن حسین بن محمد بن ابی تائب نے، یہ روایت کرتے ہیں محمد بن ابی بکر بلخی سے، یہ حافظ سلفی سے، یہ ابو عمران موسیٰ بن ابی تلمیذ سے، یہ امام ابو عمر یوسف بن عبد البر سے، انھوں نے استیعاب میں فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ نے حضرت حسان سے فرمایا: کیا تم نے ابو بکر کے بارے میں کچھ کہا ہے؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں، اور پھر یہ شعر سنائے۔ اس روایت میں ایک چوتھا شعر بھی ہے:

غار شریف میں وہ دو کے دوسرے تھے۔ بے شک ان کے گرد دشمن نے چکر بھی لگایا جب وہ پہاڑ پر چڑھا۔

یہ اشعار سن کے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خوش ہوئے اور فرمایا: اے حسان! تم نے خوب کہا۔

ان میں ایک پانچواں شعر بھی اس طرح مروی ہے کہ:

وہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے دوست اور محبوب تھے۔ یہ لوگوں کو معلوم ہے۔ وہ مخلوق میں سب سے اچھے، جن کے برابر حضور اقدس نے کسی کو نہ رکھا۔

قلت: دوسرا مصرع یوں بھی مروی ہے:

مخلوق سے کسی کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان کا بدل نہ قرار دیا۔

اس سے پہلے جو حضرت ابن عباس کی روایت گزری اس کو امام طبرانی نے ''معجم کبیر'' میں بھی روایت کیا۔ اور عبداللہ بن احمد نے ''زوائد زہد'' میں۔

اور یہ جو حدیث مرفوع ہے یعنی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ کا اشعار کو سماعت فرمانا اور ان کی تعریف کرنا۔ تو اس کی اصل امام حاکم کے یہاں مروی ہے کہ غالب بن عبداللہ نے اپنے والد سے، انھوں نے اپنے دادا حبیب بن ابی حبیب سے روایت کی ہے، ابن سعد نے طبقات کبریٰ اور امام طبرانی نے امام زہری سے روایت کی اور امام حاکم نے مجالد کے واسطہ سے امام عامر شعبی سے بھی خود ان کے بیان کے طور حدیثِ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے مثل روایت کی۔ یہاں اہل فن جانتے ہیں کہ اس طرح کی موقوف روایات بھی حدیث مرفوع کے درجہ میں ہیں، کیوں کہ مجمل کو اپنی رائے سے نہیں بیان کیا جا سکتا، اسی لیے تو کہتے ہیں کہ اگر مجمل کا بیان نہ ہوا اور قرآن کریم کا نزول بھی بند ہو گیا(۱) تو مجمل متشابہ ہو جائے گا۔ پھر یہاں یہ بات بھی خیال میں رہے کہ بیان مبین سے جا ملتا ہے، (مثلاً قرآن میں کوئی امر مجمل آیا، حدیث سے اس کا بیان ہوا، تو جو حدیث نے بیان کیا وہ نص قرآن ہی کے حکم میں ہے)(۲)

اس لیے کہ بیان کا فائدہ یہی ہے کہ وہ شک وشبہ کو دور کرے، اور جن معانی کا احتمال ہے ان میں سے کسی ایک کو متعین کر دے، لہذا بیان کا حکم وہی ہوا جو قرینہ کا ہوتا ہے، اور کلام سے جو

---

(۱) بطور کنایہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی رحلت مقصود ہے۔ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ یعنی سرکار کی حیات ظاہری میں بہ نص قرآنی یا بہ نص رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مجمل کا بیان نہ ہوا تو وہ متشابہ ہو جائے گا۔ ۱۲ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

(۲) علامہ اکمل الدین بابرتی نے عنایہ شرح ہدایہ میں تصریح کی ہے کہ قرآن کے کسی مجمل کا بیان جب کسی دلیل ظنی (مثلاً خبر واحد) سے ہو جائے تو اب حکم، قرآن ہی کی طرف منسوب ہوگا، بیان (مثلاً خبر واحد) کی طرف منسوب نہ ہوگا۔ یہی صحیح ہے۔ اسی لیے ہم قعدہ اخیرہ کی فرضیت کے قائل ہیں جب کہ اس کا بیان خبر واحد سے ہوا ہے (مگر مجمل قرآن کا بیان قرآن ہی کا حکم رکھتا ہے، اور قرآن سے فرض کا ثبوت ہوتا ہے) اور خبر واحد کی وجہ سے ہم سورۂ فاتحہ کی فرضیت کے قائل نہ ہوئے اس لیے کہ ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فاقروا ما تیسر﴾ (جو میسر ہو پڑھو) خاص ہے مجمل نہیں۔ انتہی ملخصاً۔ منہ

مفہوم ومستفاد ہووہ خود کلام ہی کی طرف منسوب ہوتا ہے جیسا کہ اصول فقہ نے اس کو واضح کر دیا،(۱) لہٰذا آیت کریمہ سے تقوی میں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی افضلیت ان کے ماسوا سب لوگوں پر ثابت ہوگئی۔ والحمد لله علی ما اولیٰ

أقول: کوئی کہے کہ صیغہ اسم تفضیل ''افعل'' یہاں کثیر الفعل کے معنی میں ہے، تو اس کا جواب دیا جائے گا کہ افعل کو کثیر الفعل کے معنی میں لینا اسم تفضیل کو مفضل علیہ سے الگ کرنا ہے جب کہ اسم تفضیل اپنی اصل وضع کے اعتبار سے مفضل علیہ کا محتاج ہے، اور کسی لفظ کو اس کی اصل وضع سے جدا کرنا اسے معنی حقیقی متبادر سے پھیرنا ہے جس کے لیے قرینہ ضروری ہے، مگر قرینہ کہاں؟ یا اس کی حاجت ہونی چاہیے تو حاجت کیا ہے؟ ہاں ''کثیر الفعل'' صیغۂ مبالغہ کا مفاد ومفہوم ہوتا ہے، مگر اسم تفضیل اور مبالغہ میں بڑا فرق ہے۔ اس سے خبردار رہنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق دینے والا ہے۔

---

(۱) بلکہ اگر حق کے طالب ہو تو ان احادیث کو دیکھو جو حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں اور یہ بتا رہی ہیں کہ حضرت صدیق کا ایمان ساری امت کے ایمان پر بھاری ہے اور جناب صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ انبیا ومرسلین کے بعد اولین وآخرین میں سب سے افضل ہیں۔ وہ سب آیت اتقی کا بیان ہوسکتی ہیں جب کہ باری تعالیٰ کا ارشاد: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عند الله أتقكم﴾ ۔تم میں اللہ کے نزدیک سب سے اکرم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ اور رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا ارشاد ''ورع میں ہم سر نہیں'' اور اس طرح کی دوسری احادیث کو نظر میں رکھا جائے۔ ایسی احادیث کی وافر مقدار ان شاء اللہ تعالیٰ میری کتاب میں تمھیں ملے گی۔

ابن عدی نے ''کامل'' میں اور دیلمی نے ''فردوس'' میں بروایت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کی ہے کہ ''اگر ابو بکر کا ایمان اس پوری امت کے ایمان کے مقابلہ میں رکھا جائے تو ابو بکر کا ایمان بھاری ہو جائے''۔

ابن راہویہ نے ''مسند'' میں اور بیہقی نے ''شعب الایمان'' میں بسند صحیح حضرت فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے: ''اگر سارے لوگوں کا ایمان ابو بکر کے ایمان سے تولا جائے تو ابو بکر کا ایمان بھاری پڑے گا''۔

اور یہ معلوم ہے کہ کمی بیشی میں تقوی اور ایمان کے درمیان تلازم ہے تو حاصل یہ ہوا کہ صدیق تقوی میں ساری امت سے افضل ہیں۔ اس طرح مجمل کا بیان ہوگیا۔ اور حمد ہے اللہ کے لیے جو احسان کا مالک ہے۔ ۱۲ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

باب سوم

شبہہ ثالثہ:

اس شبہہ کا تعلق اہل سنت و جماعت کے قیاس کے کبریٰ سے ہے، وہ یہ ہے کہ آیت کریمہ ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَاللهِ أَتْقٰكُمْ﴾ میں محمول ''اتقی'' ہے، لہٰذا دونوں مقدموں کا حاصل یہ ہوا کہ ''صدیق اتقی ہیں'' اور ''ہر اکرم اتقی'' ہے۔ یہ کسی بھی طرح شکل اول نہیں۔ (اس لیے کہ شکل اول میں حد اوسط صغری میں محمول کبری میں موضوع ہوتا ہے اور یہاں دونوں میں محمول ہے جو شکل ثانی میں ہوتا ہے مگر یہ) شکل ثانی بھی نہیں، اس لیے کہ کیف میں اختلاف نہیں۔ اور اگر یہاں کبریٰ کا عکس کر دیا جائے تو موجبہ جزئیہ ہوگا یعنی ''بعض اتقی اکرم ہیں'' اب شکل اول بنانا چاہیں تو پھر شرط مفقود کہ کبریٰ کا کلیہ ہونا ضروری ہے، اور یہ موجبہ جزئیہ ہے۔ لہٰذا یہ حضرات کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں یعنی ﴿سَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ اور ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَاللهِ أَتْقٰكُمْ﴾ کا جو مفاد ہے نہ ہمیں مضر اور نہ تمہیں مفید۔ یہ وہی شبہہ ہے جس کے بارے میں مجھے یہ خبر پہنچی کہ کسی تفضیلی نے ہمارے کسی عالم کے سامنے پیش کیا تھا۔

وأنا أقول وبالله التوفيق۔ کتنا ضعیف و کمزور اعتراض ہے جو بالکلیہ غلط، ساقط، باطل اور عاطل ہے، قطعاً جواب کا مستحق نہیں، لیکن چوں کہ مخالفین کی طرف سے پیش ہوا اور پوچھا گیا ہے تو صحیح بات کا اظہار ضروری ہے۔

لہٰذا اچھی طرح جان لو کہ رب لطیف کے لطف خفی نے اس فلسفی کے مکر و فریب کا قلع قمع کرنے کے لیے مجھے بارہ طریقوں سے توفیق بخشی، ان بارہ میں تین وجہیں اصل ہیں، ان سب کا بیان سنیے جن میں سے ہر ایک کافی و شافی ہے۔

پہلی وجہ: اگر اس معترض کو قرآن و حدیث کے محاورات۔ یا۔ شان نزول میں علما کی روایات۔ یا۔ تفسیر قرآن میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی احادیث مرفوعہ۔ یا۔ علمائے کرام اور جلیل القدر ائمہ عظام کے کلمات کا علم ہوتا۔ یا۔ کسی خطاب کو سمجھنے، مطلب کو جاننے اور

کلام کو اس کی مطلوبہ غرض پر منطبق کرنے کی کچھ بھی لیاقت ہوتی تو وہ جان لیتا کہ آیت کریمہ میں ''اکرم'' کو محمول بنانا اور ''اتقی'' کو موضوع قرار دینا ہی معتبر وصحیح ہے۔ یہاں کلام یوں صادر ہوا کہ خبر کو مقدم کر دیا گیا اور مبتدا کو مؤخر۔ ہمارا یہ دعویٰ چند دلیلوں سے ثابت ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے احسان اور لطف عام سے مجھے اس پر مطلع فرمایا۔

فأقول: تو اب سنو میں کہتا ہوں:

اولاً: زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنے نسب پر فخر کرتے اور گمان کرتے کہ جس کا نسب بہتر وہی افضل، اسلام آیا تو اس نے جاہلیت کے اس خیال کو رد فرما دیا اور ارشاد فرمایا: ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ﴾ بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑا پرہیزگار ہے۔

تو اختلاف اس بارے میں واقع ہوا کہ افضل کی صفت سے موصوف کون ہے، اس میں اختلاف نہ تھا کہ صفت افضل کیا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی پوچھنے والا پوچھے کہ کھانوں میں سب سے مزے دار کھانا کون سا ہے؟ تو کوئی کہے: ''الحامض الذ'' کھٹا سب سے زیادہ مزہ دار ہے۔ اس کا رد کرتے ہوئے تم کہو: نہیں، بلکہ ''ألذُّها أحلاها'' سب سے زیادہ مزہ دار کھانا وہ ہے جو سب سے میٹھا ہو۔ تو تمہاری مراد یہی ہوئی کہ جو سب سے زیادہ میٹھا ہے وہ سب سے زیادہ مزہ دار ہے۔ (''ألذُّها أحلاها'' میں نحوی ترکیب کے لحاظ سے اگرچہ ''الذّ'' مبتدا اور ''أحلی'' خبر ہے مگر مراد ہے ''الأحلی هو الالذّ'' اس میں ''أحلی'' مبتدا ہے ''الذّ'' خبر) اس کی وجہ یہ ہے کہ آیت میں جو ''اتقی'' وارد ہوا وہ تمہارے قول میں واقع ''احلی'' کی طرح ہے، کہ دونوں ذات کے لیے مرآۃ ملاحظہ ہیں یعنی ان دونوں کے ذریعہ ذات کی نشان دہی مقصود ہے جو محکوم علیہ ہے، اور اکرم جس کا معنی افضل ہے اسی کا ذات ''اتقی'' پر حکم لگایا گیا، تو اتقی محکوم علیہ ہوا اور اکرم محکوم بہ، جیسے ''الذ'' کا حکم ''أحلی'' پر لگایا گیا۔ تو ''احلی'' محکوم علیہ اور ''الذ'' محکوم بہ۔ اور خبر وہی ہوتی ہے جس کا حکم لگایا گیا۔ نہ وہ جس پر حکم لگایا گیا۔

ایسی عبارات کو وہ خوب سمجھتا ہے جس کو کلام عرب میں تھوڑی سی بھی مہارت ہو، کہ

ایسا کلام جیسے ہی پیش آتا ہے تو ذہن اسی طرف سبقت کرتا ہے کہ اس سے متقیوں کی مدح مقصود ہے، اور تقویٰ کی طرف رغبت دلانے کے ساتھ اس وعدۂ جمیل کی بشارت سنانا منظور ہے کہ جو صاحب تقویٰ ہوگا ہمارے یہاں کرامت وعظمت والا ہوگا۔

اس مقام پر مفسرین نے بھی یہی سمجھا ہے، سنئے یہ زمخشری جو عربی ادب میں باریک بیں اور کلام عرب کی معرفت میں یگانہ تھا، وہ اپنی تفسیر میں کہتا ہے: مطلب یہ ہے کہ تمہاری ترتیب کنبوں اور قبیلوں پر جو رکھی گئی ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ تم ایک دوسرے کا نسب جان لو اور اپنے آبا واجداد کے سوا دوسرے کی طرف نسبت نہ کرو، یہ مطلب نہیں کہ تم اپنے کنبوں اور قبیلوں کی بنیاد پر اپنے آبا واجداد پر فخر کرنے لگو، اور نسب میں برتری کا دعویٰ کردو۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ خصلت بیان فرمائی جس کی بنیاد پر ایک انسان دوسرے سے برتر ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں شرف وعزت پاتا ہے، تو ارشاد فرمایا: ﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ اس آیت میں ایک قراءت ''أنّ'' مفتوحہ کی بھی ہے، اب مطلب یہ ہے کہ گویا یہ سوال ہوا کہ نسب میں فخر کیوں نہ کیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اس وجہ سے کہ تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، وہ نہیں جو سب سے بڑے نسب والا ہے۔ الخ۔ اسی طرح امام نسفی نے بھی مدارک میں تحریر فرمایا۔

وأقول ثانیاً: دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم تو اسی لیے نازل ہوا ہے کہ ان احکام کو بیان فرمائے جن کا علم بندوں کو اس کے بتائے بغیر نہیں ہو سکتا ہے۔ جیسے نجات وہلاکت، عزت وذلت، مردود ومقبول ہونا، اور غضب ورضائے الٰہی۔ یہ قرآن محسوسات کو بیان کرنے کے لیے نہیں اترا، اب دیکھو کہ آدمی کا پرہیزگار اور بدکار ہونا ان چیزوں میں سے ہے جن کا علم حس سے ہو جاتا ہے (اور اللہ کے نزدیک اکرم وافضل ہونا، یہ رب کے بتائے بغیر بندے کی حد ادراک سے باہر ہے، اس لیے آیت میں بتایا گیا کہ جو اتقی ہے وہی عند اللہ اکرم ہے) اس ضابطہ کی روشنی میں اکرم کو موضوع اور محکوم علیہ بنانا گویا قلب موضوع ہے۔ واقعی بات یہ ہے کہ یہ وجہ میرے ذہن میں اسی وقت آگئی تھی جب میں نے اس شبہ کو سنا تھا، اس کے بعد جب میں اس کتاب کی تصنیف میں مشغول ہوا اور میں نے تفسیر امام رازی ''مفاتیح الغیب

'' کی طرف رجوع کیا تو میں نے فاضل مدقق کو دیکھا کہ وہ اس شبہ پر آگاہ ہوئے اور انھوں نے اس کے تعلق سے قریب قریب وہی کلام فرمایا جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے،

وہ فرماتے ہیں:

اعتراض: اگر یہ کہا جائے کہ آیت کریمہ تو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہر وہ شخص جو اکرم ہوگا وہ اتقی ہوگا، اس سے یہ تو لازم نہیں آیا کہ ہر وہ شخص جو اتقی ہو وہ اکرم بھی ہو۔

جواب: انسان کا اتقی ہونا ایسا وصف ہے جو معلوم ومحسوس ہے، اور انسان کا اکرم وافضل ہونا ایسا وصف ہے جو نہ معلوم ہے نہ محسوس۔ اور معلوم سے متعلق نا معلوم چیز کو بتانا یہی اچھا طریقہ ہے، اس کے برعکس کہو تو غیر مفید ہے [یعنی نا معلوم سے متعلق کوئی معلوم بتانا بے فائدہ ہے] لہذا تقدیر آیت یہ ہے کہ گویا یہاں پر شبہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اکرم وافضل کون ہے؟ تو اس کے جواب میں فرمایا گیا کہ ''اکرم اتقی ہے'' اور جب بات یہ ہوئی تو آیت کی تقدیر وترتیب یوں ہوئی ''اتقاکم اکرمکم عند اللہ'' یعنی تم میں سب سے زیادہ پرہیزگار ہی اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے زیادہ عزت والا ہے۔

قلت: شاید تم پر پوشیدہ نہ ہو وہ فرق جو دونوں تقریروں میں ہے۔ اور وہ عظیم فرق بھی تم پر مخفی نہ ہوگا جو اس وجہ اور ہماری دوسری باقی وجوہ میں ہے۔ ذلك فضل اللہ یوتیہ من یشاء والحمد للہ رب العالمین۔

ثم أقول: قریب ہے کہ وہم تم پر حملہ آور ہو کر بے چین کرے اور تمھیں یہ بولنے پر مجبور کرے کہ کیا تقویٰ افعال قلوب سے نہیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى﴾ یہ ہیں جن کے دل اللہ تعالیٰ نے پرہیزگاری کے لیے پرکھ لیے ہیں۔ دوسری آیت میں ہے: ﴿وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ﴾ اور جو اللہ کے نشانوں کی تعظیم کرے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔

حدیث شریف میں حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، تقویٰ یہاں ہے، حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنے سینہ اقدس کی طرف اشارہ فرماتے تھے۔ اس حدیث کو امام مسلم اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین نے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ہر چیز کی ایک کان ہوتی ہے، اور تقویٰ کی کان عارفین کے قلوب ہیں۔ اس حدیث کو امام طبرانی نے حضرت عبداللہ بن عمر، اور امام بیہقی نے حضرت عمر فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا۔

پھر آپ نے کیسے کہہ دیا کہ تقویٰ محسوسات سے ہے؟

قلت: ہاں بے شک تقویٰ کا مقام قلب ہے، اسی بنیاد پر تو ہم کہتے ہیں کہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب تمام امت سے زیادہ تقویٰ والے تھے تو ضروری ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی سب سے زیادہ حاصل ہو۔ لیکن واضح رہے کہ دل اعضاو جوارح کا بادشاہ ہے، لہذا جب دل پر کسی چیز کی سلطنت غالب ہو جاتی ہے تو تمام اعضا اس کے تابع دار ہو جاتے ہیں اور اعضا پر اس کے آثار صاف جھلکتے ہیں۔

حیاو حزن اور خوشی و غضب وغیرہ صفات قلب میں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے، مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سنو بے شک جسم میں ایک گوشت کا لوتھڑا ہے، جب وہ درست ہو گیا تو سارا جسم درست و صحیح ہے، اور اگر وہ بگڑ گیا تو سارا جسم بگڑ گیا۔ سنتے ہو! وہ دل ہے۔ اس حدیث کو امام بخاری اور امام مسلم نے نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

دوسری حدیث میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب تم مرد کو مسجد آنے جانے کا عادی پاؤ تو اس کے مومن ہونے کی گواہی دو۔ اس حدیث کو امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، ابن خزیمہ، ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

أقول ثالثاً: تیسری وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے آیت کریمہ کے شان نزول کے بارے میں جو تفصیلات ذکر ہوئیں۔ وہ صحیح و درست اور قرآن کریم کے معنی کے مطابق اسی وقت ہو سکتی ہیں جب آیت کریمہ میں ''اتقی'' ہی موضوع ہو، اگر اس کے بر عکس کہیں یعنی ''اکرم'' کو موضوع بنائیں تو مقصد حاصل ہی نہیں ہوتا۔ اور تیر نشانہ پر نہیں بیٹھتا۔

اس سے پہلے یزید بن شجرہ کی ایک روایت گذری جس میں اس بات کا ذکر تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایک سیاہ فام غلام کی عیادت کی تھی، اس روایت سے استدلال اس طرح ہوگا کہ تم نے اے لوگو! اس غلام کو حقیر جانا، اس لیے کہ یہ کالا کلوٹا غلام ہے، اور اسی لیے تم نے کہا تھا کہ ایک ذلیل کی عیادت کی اور پھر اس ذلیل کے جنازہ میں شرکت بھی فرمائی۔

لیکن واضح رہے کہ وہ ہمارے نزدیک کریم و بزرگ ہے، کیوں کہ وہ متقی تھا، اور ہمارے یہاں فضیلت کا مدار تقویٰ ہے، تو جو متقی ہوگا وہ بزرگ ہوگا، خواہ وہ کالا کلوٹا ناک کٹا غلام ہی ہو۔ ذوق سلیم رکھنے والے کے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم و مطلب بھی اسی نہج پر ہے۔

البتہ اے تفضیلیو! تم نے جس معنی کا یہاں گمان کیا ہے اس کے اعتبار سے تو اللہ تعالیٰ کے فرمان کا خلاصہ یہ ہوگا کہ "وہ بزرگ تھا" اور ہر بزرگ متقی" لہذا ہمارے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس کی عیادت کی اور اس کے دفن میں شریک ہوئے۔

یہ استدلال کیسا ناقص ہے تم نے دیکھ لیا، اس لیے کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ یہاں استدلال ایسی چیز سے ہوتا جو ان کو تسلیم ہے، اور وہ ایسی چیز کو مستلزم ہوتا جو ان کو مسلم نہیں۔ جیسے ہماری تقریر کے مطابق تقویٰ۔

اور کرامت و بزرگی کا حال یہ ہے کہ یہ تو ان کے نزدیک اس غلام کو حاصل ہی نہیں تھی، ورنہ وہ تمام باتیں نہ کہتے جو انھوں نے کہیں۔ اس کے علاوہ وہ مقدمہ جو آیت کریمہ میں مذکور ہوا اس صورت میں تو عبث ٹھہرے گا۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ۔ اس لیے کہ ان کفار کا رد تو اس قضیہ پوشیدہ کے ذریعہ تام ہو گیا جس میں یہ دعویٰ ہے کہ وہ شریف و بزرگ مرد ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک۔ پھر اب اس کے بعد کون سی حاجت ہے کہ کہا جائے: ہر کریم و بزرگ متقی ہے، اس لیے کہ نزاع تقویٰ کے بارے میں نہیں تھا بلکہ فضیلت و شرافت کے بارے میں تھا۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس صورت میں لازم آتا ہے کہ دعویٰ صغریٰ ہو، اور نتیجہ وہ نکلے جو دعویٰ نہیں۔

یہی تمام گفتگو مقاتل کی روایت اور قریش کا عتیق العتیق حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ

عنہ کو حقیر گردانے والی روایت میں جاری ہوگی۔

اب ہم دوسرے طریقے سے ثابت کرتے ہیں، اس لیے کہ "کل جدید لذیذ"

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حقارت کے سلسلہ میں کفار کا استدلال اس طرح تھا کہ "وہ غلام ہیں" اور "کوئی غلام عزت والا نہیں" لہذا "بلال عزت والے نہیں۔

یہ آیت کریمہ ان کافروں کے رد میں نازل ہوئی، لہذا ضروری ہے کہ ان کے قیاس کے دو مقدموں میں سے کسی ایک مقدمہ پر نقض وارد کیا جائے اور اس کو باطل قرار دے دیا جائے۔ مگر یہاں پہلا مقدمہ صغریٰ تو ایسا ہے جو بالکل درست اور واقع کے مطابق ہے، یعنی حضرت بلال غلام تھے، تو متعین ہو گیا کہ کبریٰ باطل ہے، اور آیت کریمہ اسی کے ابطال کے لیے نازل ہوئی، لہذا قرآن کی آیت نے اس کو اس طرح باطل کیا کہ کبریٰ کاذب ہے، اس لیے کہ اس کی نقیض ثابت ہے، کفار کے کبریٰ کی نقیض یہ ہے کہ "بعض غلام باعزت ہیں" اب اس قضیہ موجبہ جزئیہ کا اثبات صرف ہمارے طریقہ پر ہی ہو سکتا ہے، یعنی اس طرح کہ ہم کہیں: بعض غلام اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں، اور وہ جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے وہی عزت والا ہے، اب رہا تمہارے طریقہ پر استدلال کہ قیاس کے دونوں مقدمے اس طرح ہوں کہ "بعض غلام متقی ہیں" اور "ہر عزت والا متقی ہے" تو یہ وہی قیاس ہے جس کو تم دفع کر چکے [کہ یہ شکل اول نہ ہوئی اس لیے کہ حد اوسط صغریٰ کبریٰ دونوں میں محمول ہے اور شکل ثانی بھی صحیح نہیں اس لیے کہ کیف میں اختلاف نہیں]۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں بھی یہ تقریر دونوں طریقوں سے جاری ہوگی۔

اب ہم تیسرے طریقہ سے ثابت کرتے ہیں:

حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بعض اہل مجلس کی تحقیر اس طرح کی تھی کہ اس کو "اے فلانی کے بیٹے" کہا تھا، یعنی: اے نسب میں کم تر! لہذا اللہ تعالیٰ نے ان کا رد اس طرح فرمایا کہ اگر تمہارا گمان یہ ہے کہ بعض کم تر نسب والے کریم و شریف نہیں، تو تمہاری یہ بات تو سچی ہے، لیکن اس بنیاد پر اس خاص شخص کو تم نے کیوں حقیر جانا؟ اس لیے کہ ہو سکتا ہے یہ

ان بعض میں نہ ہو۔ اور اگر تمہاری مراد سلب کلی ہے تو یہ قطعاً باطل ہے، یعنی یوں کہنا کہ ''کوئی بھی کم تر نسب والا کریم وشریف نہیں'' یہ باطل ہے، کیوں کہ اگر اس کو صادق کہا جائے تو پھر یہ قضیہ بھی صادق ہوگا۔ یعنی ''بعض متقی شریف نہیں'' اس لیے کہ ان میں کے بعض نسب میں کم تر ہیں [شکل اول کی ترتیب پر اس کو یوں کہا جا سکتا ہے، بعض متقی نسب میں کم تر ہیں، اور کوئی کم تر نسب والا کریم نہیں، تو نتیجہ یہ نکلا کہ بعض متقی کریم نہیں] تو تمہارے نزدیک وہ شریف و بزرگ نہ ہوں گے، لیکن تالی باطل ہے، یعنی ''بعض متقی شریف نہیں'' اس لیے کہ اس کی نقیض صادق ہے، یعنی ''ہر متقی کریم ہے'' تو مقدم بھی اسی طرح باطل ہے، یعنی وہ قضیہ سالبہ کلیہ۔ یہ استدلال ہمارے طریقہ پر ہوگا۔(۱)

اس تقریر کو اچھی طرح ذہن نشین کر لو کہ اس وقت فیض کی بارش موسلا دھار ہے۔

....

(۱) یہ قیاس استثنائی ہوا جس میں ایک قضیہ شرطیہ ذکر کر کے اس کے مقدم یا تالی کا استثنا کیا جاتا ہے، اگر وہ شرطیہ متصلہ ہو تو نتیجہ وضع مقدم سے وضع تالی ہوگا، اور رفع تالی سے رفع مقدم۔ جیسے:

لو كانت الشمس طالعة لكان النهار موجوداً.

لكن الشمس طالعة .فالنهار موجود

(یہ وضع مقدم سے وضع تالی ہے)

یا کہا جائے:

لكن النهار ليس بموجود .فالشمس ليست بطالعة

(یہ رفع تالی سے رفع مقدم ہے)

درج بالا کلام میں قیاس استثنائی کی ترتیب یوں ہوئی:

لو صدق "ليس أحد من دَنِيِّ النسب بكريم "لصدق قولنا"بعض المتقي ليس بكريم"(للقياس المطويّ المذكور)

لكن التالي(أي بعض المتقى ليس بكريم)باطل لصدق نقيضه"كل متقٍّ كريم"

فالمقدم(أي ليس أحد من دني النسب بكريم)مثله(أى باطل).

اگر تمہارے طریقہ پر کہا جائے تو مقدمہ استثنائیہ یہ ہوگا کہ...

''ہر کریم متقی ہے'' اس سے لازم (بعض متقی شریف نہیں) رفع نہیں ہوتا۔ تو ملزوم (کوئی کم تر نسب والا کریم نہیں) بھی رفع نہ ہوگا۔ اس لیے کہ "بعض المتقى ليس بكريم" کی نقیض ''کل کریم متق'' نہیں۔ تو اس سے تالی کا ابطال نہ ہو سکے گا اور مقدم اپنی جگہ رہ جائے گا۔ (مترجم)

واقـول رابـعـاً: چوتھی وجہ یہ ہے کہ وہ احادیث جو آیت کریمہ کی تفسیر میں آئیں۔یا۔اس کے نہج پر وارد ہوئیں۔یا۔اس کے شواہد وامثال کے طور پر مروی ہوئیں وہ ہمارے ذکر کردہ مقصد کا افادہ کرتی ہیں اور تمہارے معنی فاسد کا انکار کرتی ہیں۔وہ احادیث یہ ہیں:

پہلی حدیث:

ہم سے حدیث بیان کی مولیٰ سراج نے،انھوں نے روایت کی جمال سے،انھوں نے عبداللہ سراج سے۔

تحویل سند، نیز ہم نے ایک درجہ عالی سند سے مولیٰ سراج سے روایت کی،انھوں نے اپنے والد عبداللہ سراج سے،انھوں نے محمد بن ہاشم سے۔

تحویل سند، یہ ایک اور سند ہے، جو عالی سند کے مساوی ہے، کہ مولیٰ سراج نے جمال سے روایت کی،انہوں نے سندی سے۔

اور دو درجہ عالی سند سے مجھ سے حدیث بیان کی سیدی جمل اللیل نے،انہوں نے سندی سے روایت کی، دونوں نے اپنی سند سے صالح عمری سے، یہاں تک کہ یہ سندیں امامین جلیلین بخاری ومسلم تک پہنچیں۔پھر ان دونوں اماموں نے اپنی سند سے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: سب سے زیادہ فضیلت والا کون؟ فرمایا: سب سے بڑی فضیلت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔

أقـول: اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نشانیاں تو دیکھو کہ کس طرح کشادہ راہ واضح فرماتا ہے اور کسی کے لیے حجت کا موقع نہیں چھوڑتا۔

مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اسی طریقہ پر سوال ہوا تھا کہ کون سا شخص سب سے زیادہ فضل والا ہے؟ یعنی اکرمیت وافضلیت سے کون موصوف ہے؟ یہ سوال نہیں تھا کہ اکرم کی ماہیت کیا ہے اور اکرم کسے کہتے ہیں۔اور یہ سوال بھی نہیں تھا کہ اکرم کونسی صفت سے واضح ہوگا۔لہذا حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آیت کریمہ کے الفاظ میں جواب عنایت فرمایا۔اب بتاؤ کہ اگر "اتقیٰ" کو موضوع قرار دے کر جواب نہ دیا جاتا تو جواب سوال کے مطابق ہی نہ ہوتا۔لہذا تم پر لازم ہے کہ فاسد خیال سے اپنے آپ کو پاک کرلو۔اور

اللہ تعالیٰ کا مزید انعام یہ ہے کہ شارحین حدیث نے مراد کو معین کر دیا اور ہر وہم کو قطع کر دیا۔

علامہ مناوی فرماتے ہیں: لوگوں میں زیادہ فضیلت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔ اس لیے کہ کرم کے اصلی معنی کثرت خیر ہیں، تو جب متقی دنیا میں خیر کثیر والا ہے اور اس کو آخرت میں بلند درجات حاصل ہوں گے تو لوگوں میں یہی زیادہ عزت والا ہوگا، لہذا یہ اتقی ہی ہے جو عزت والا قرار پائے گا، انتہی۔

دیکھو! کہاں گیا وہ تمہارا کمزور شبہ۔ تو کیا اب تمہیں اس کا کوئی نشان نظر آرہا ہے۔

دوسری حدیث:

ہم سے حدیث بیان کی مولیٰ عبدالرحمٰن نے، انھوں نے روایت کی شریف محمد بن عبد اللہ سے، جیسا کہ گذرا۔ انھوں نے علی بن یحییٰ زیادی سے، انھوں نے شہاب احمد بن محمد رملی سے، انھوں نے امام ابوالخیر سخاوی سے، انھوں نے عز عبدالرحیم بن فرات سے، انھوں نے صلاح بن ابی عمر سے، انھوں نے فخر بن بخاری سے، انھوں نے فضل اللہ ابوسعید توقانی سے، انھوں نے امام محی السنہ بغوی سے، یہ فرماتے ہیں کہ ہمیں خبر دی ابوبکر بن ابی ہیثم عبداللہ بن حمویہ نے، انہیں خبر دی ابراہیم بن خزیم نے، یہ فرماتے ہیں کہ ہم سے حدیث بیان کی عبد بن حمید نے، ان سے ضحاک بن مخلد نے، انہوں نے روایت کی موسیٰ بن عبیدہ سے، انہوں نے عبد اللہ بن دینار سے، انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے، آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن اپنی سواری پر اس طرح طواف فرمایا کہ اپنے عصائے مبارک سے کعبہ کے کونوں کا بوسہ لیتے جاتے تھے، جب وہاں سے باہر تشریف لائے تو سواری کو بٹھانے کی جگہ نہ پائی، لہذا لوگوں کے ہاتھوں پر سواری سے اتر آئے، پھر کھڑے ہو کر خطبہ ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتے ہوئے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہے جس نے تم سے جاہلیت کا گھمنڈ اور اس کا غرور دور فرمایا، اے لوگو! دو طرح کے آدمی ہیں، ایک نیک متقی اللہ کے یہاں عزت والا۔ دوسرا بدکار، بدبخت اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ذلیل، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى ﴾ اے لوگو! ہم نے تم کو مرد وعورت سے پیدا کیا۔ پھر فرمایا: میں یہ بات کہتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے اپنے اور تمہا

رے لیے مغفرت چاہتا ہوں۔

أقول: دیکھو! مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے مخلوق کو کس طرح دو قسموں میں منقسم فرمایا، ایک نیکو کار پرہیز گار۔، اس کو کرم وفضیلت سے متصف فرمایا۔ دوسرا بدکار بدبخت۔ اور اسے ذلیل بتایا۔ یہ ہمارے دعویٰ کی صریح دلیل ہے۔ (یعنی کرم کو محمول اور محکوم بہ بنانا)

تیسری حدیث:

ابن النجار اور رافعی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دعا کا یہ حصہ روایت کیا (اے اللہ مجھے علم کے ذریعہ غنا، حلم کے ذریعہ زینت، تقوی کے ذریعہ عزت اور عافیت کے ذریعہ جمال عطا فرما) علامہ مناوی نے کہا" مجھے تقوی کے ذریعہ عزت دے، تاکہ تیرے نزدیک سب سے زیادہ عزت والوں سے ہو جاؤں۔ بے شک اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت سب سے زیادہ تقوی والا" اھ۔

اقول: اچھا یہ تھا کہ علامہ مناوی (من أکرم من الناس) میں (من) نہ لاتے۔ گویا ان کی مراد وہ ہے جو امت باقتدائے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم مراد لے گی۔ (ورنہ سرکار کے مناسب تو یہی دعا ہے: لأکون أکرم الناس علیك۔ تاکہ میں تیرے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہو جاؤں)

چوتھی حدیث:

زمخشری نے کشاف میں پھر امام نسفی نے مدارک میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے نقل کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جس کو اس بات کی خوشی ہو کہ وہ سب لوگوں سے زیادہ عزت وفضیلت والا ہو تو اللہ تعالیٰ سے ڈرے۔

یہ حدیث تو ہمارے دعویٰ پر زیادہ ظاہر اور روشن دلیل ہے۔

وأقول خامساً: پانچویں وجہ یہ ہے کہ علمائے کرام نے اس آیت سے متقیوں کی تعریف ہی سمجھی، اور اس آیت سے تقویٰ اور اہل تقویٰ کی فضیلت پر استدلال فرماتے رہے، اگر معاملہ وہ ہوتا جو تم سمجھے ہو تو یہ سارے استدلال سرے سے باطل ہو جاتے، کیوں کہ جب

معنی یہ ٹھہرے کہ ''ہر کریم وصاحب فضیلت متقی ہے'' اور یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ ''ہر متقی کریم صاحب فضل ہے'' تو اس میں پرہیز گاروں کی کون سی تعریف ہوئی، اور پرہیز گار دوسروں سے اس وصف میں کس طرح برتر قرار پائے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ ''ہر کریم انسان بھی حیوان اور جسم بھی'' مگر ان تینوں اوصاف میں سے کسی بھی وصف کی بنیاد پر کریم کو دینی خوبی کا حامل نہیں قرار دیا جاتا۔

فان قلت :اگر تم کہو کہ تقویٰ ایسا وصف ہے جو عزت اور فضیلت والوں کے ساتھ خاص ہے، اس لیے یہ وصف تعریف وخوبی کا مستحق ہے، اور آپ کے ذکر کردہ اوصاف ایسے نہیں۔

قلت :میں کہتا ہوں: ہاں اب تم اسی بات پر آگئے جس کا اب تک انکار کر رہے تھے، اس لیے کہ تقویٰ جب فضیلت والوں اور باعزت اشخاص کے ساتھ خاص ہے تو اب یہ کہنا بلا شبہ درست کہ ''ہر متقی کریم ہے'' بس اس سے ہمارا مقصد ثابت ہو گیا۔

مولانا فاضل ناصح محمد آفندی رومی برکلی طریقہ محمدیہ میں تقویٰ کے تعلق سے آیات ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: لہذا تم ان آیات میں غور کرو جو ہم نے لکھیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متقی ہی زیادہ عزت وفضیلت والا ہے۔

طریقہ محمدیہ کے شارح عارف باللہ سیدنا حضرت مولانا عبدالغنی نابلسی اس کی شرح میں فرماتے ہیں: مصنف کا اشارہ پہلی آیت ﴿ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَاللّٰهِ أَتْقٰكُمْ ﴾ کی طرف ہے۔

وأقول سادساً: (اے توفیق یافتہ میری طرف آ، یہ ایک تحقیق ہے جو لائق قبول ہے) چھٹی وجہ یہ ہے کہ امام احمد بن حنبل، امام حاکم، اور امام بیہقی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: آدمی کی عزت اس کا دین ہے، اس کی مروت اس کی عقل ہے۔ اور اس کا حسب اس کا خلق ہے۔

ابن ابی الدنیا نے کتاب الیقین میں یحییٰ بن ابی کثیر سے بسند مرسل روایت کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: عزت، تقوی ہے اور شرف، تواضع ہے۔ (عزت، پرہیز گاری ہے اور شرافت، خاک ساری ہے۔

امام محمد بن علی حکیم ترمذی نے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مرفوعا

روایت کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: حیا زینت ہے اور تقویٰ کرم ہے۔

ان احادیث کو دیکھو کہ کس قدر روشن اور کتنی فصیح ہیں، اور کیسی شیریں اور کیسی ملیح ہیں۔
حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ''آدمی کی مروت اس کی عقل ہے'' دیکھو تو معلوم ہو گا کہ آپ نے عقل ہی کو مروت سے موصوف قرار دیا، مروت کو عقل سے نہیں۔ اسی طرح آپ نے فرمایا: آدمی کا حسب اس کا خُلق ہے اور شرف تواضع۔ لہٰذا آپ نے خُلق پر حسب کا حکم لگایا اور تواضع پر شرف کا۔

حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس فرمان میں ان لوگوں کا رد فرمایا جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ مال ہی شرف ہے۔ اسی لیے اگر کوئی شخص یوں کہنے لگے کہ حسب خلق ہے، مروت عقل ہے اور شرف تواضع ہے، تو اس کا یہ قول مقبول نہ ہو گا (یعنی خلق، عقل اور تواضع کو محکوم بہ اور خبر بنا کر استعمال کرے) اور اگر اس کا عکس کر دے تو قبول کر لیا جائے گا۔ اسی طرح حدیث کے دونوں فقرے یعنی ''کرم تقویٰ ہے اور آدمی کی عزت اس کا دین ہے'' کہ ان فقروں میں عکس مقبول نہیں۔

ایسے مقامات کے لیے میں تمہیں ایک ضابطہ اور قاعدہ دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ جب تم ایسے مقامات میں دو اسم معرف باللام دیکھو کہ ان میں ایک دوسرے پر محمول ہوتا ہے، تو اگر دوسرے کا پہلے کے لیے بغیر الف لام محمول بننا صحیح ہو تو جان لو کہ وہ اس قضیہ میں بھی محمول ہو سکتا ہے، ورنہ نہیں، اس کی نظیر شاعر کا یہ شعر ہے:

بنو نا بنوأ بنا ئنا و بناتُنا

بنوهن أبنا ء الرجا ل الأباعد

یعنی ہمارے بیٹے بیٹوں کے بیٹے ہیں، اور ہماری بیٹیوں کے بیٹے دور کے لوگوں کے بیٹے ہیں،

اس لیے کہ اگر تم یوں کہو کہ'' بنو أبنائنا بنونا '' ہمارے پوتے ہمارے بیٹے ہیں تو یہ صادق ہو گا۔ اور اگر یوں کہنے لگو کہ '' أبناء نا بنو أبنائنا '' ہمارے بیٹے ہمارے پوتے ہیں تو یہ کاذب ہو گا۔ لہٰذا اس شعر میں ''بنو نا '' محکوم بہ ہی ہے۔

ایسی ترکیبوں میں راز یہ ہے کہ محمول کا نکرہ لانا ہمیشہ جائز ہے، اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ قاعدہ کلیہ ہے کہ محمول کو معرف باللام لاکر محمول کو موضوع پر محصور کرنے کا فائدہ ہوتا ہے تو یہ مقصود سے ایک زائد بات ہے۔ اور یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ موضوع کو کبھی نکرہ محضہ نہیں لایا جاتا۔ اسی لیے تو جائز نہیں کہ ''الکرم تقوی'' یا ''الکرم دین'' کہا جائے، اس مقام پر ''تقویٰ اور دین'' کو معرف باللام ہی لایا جائے گا۔ اس لیے کہ یہ بعد میں آنے والے الفاظ ہی موضوع ہیں، اسی لیے اگر یہ جملے اس کے برعکس لائے جائیں اور پہلے جز کو بصورت نکرہ ذکر کیا جائے، مثلاً [التقوی کرم۔ الدین کرم] تو معنوی اعتبار سے درست ہوں گے۔ کیا تم نے امام حکیم ترمذی کی مذکورہ حدیث میں نہیں دیکھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جب ''تقوی'' کو مقدم فرمایا تو ''کرم'' کو نکرہ ذکر فرمایا، اور اس کے برعکس جب اس کو مؤخر فرمایا تو معرف باللام ارشاد فرمایا: اللھم لك الحمد علی تواتر آلائك (الٰہی، تیری پے در پے نعمتوں پر تیرے لیے حمد ہے۔

اے معترض شخص! میں نہیں سمجھتا کہ تو ناسمجھی کی اندھیریوں میں ایسا دبا چھپا ہوا ہوگا کہ تیرے اوپر مذکورہ احادیث کی ان چمکتی تجلیوں سے بھی متنبہ و خبردار ہونا دشوار ہو جن کی روشنی لگتا ہے کہ تیرے ان شبہات کی آنکھوں کو اچک لے گی، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے کبھی ''کرم'' کو مقدم فرمایا، اور کبھی ''تقویٰ'' کو صدر کلام میں ذکر فرمایا۔

خاص طور امام حکیم ترمذی کی روایت کردہ حدیث پاک میں۔ نیز اصول میں یہ بات طے ہو چکی کہ الف لام جب عہد کے لیے نہ ہو تو استغراق کے لیے ہوگا، بلکہ اگر جنس کا مانا جائے جب بھی استغراق کا فائدہ پہنچائے گا، اس لیے کہ جنس کا حکم یہ ہے کہ لازماً تمام افراد اس میں برابر ہوں۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

وأقول سابعاً: ساتویں وجہ یہ ہے کہ اگر تم سے یہ بات کہی جائے کہ لوگوں میں سب سے زیادہ عظمت والا شخص زیادہ پرہیزگار ہے۔ پھر وہ شخص جو تقویٰ میں اس سے کم ہے۔ پھر اسی طرح وہ شخص جو تھوڑا تھوڑا تقویٰ میں کم ہوتا جائے وہ اکرم اور زیادہ عظمت والا ہے۔ لا محالہ تم یہ تسلیم کرلو گے اور کہو گے، یہ ایسی بات ہے جس میں کوئی شک نہیں۔ لیکن تم اتنی بات نہیں

سمجھ سکے کہ اب تم اس سے پھر گئے جس کا تم نے ارتکاب کیا تھا اور اب اس بات کا اعتراف کر لیا جس سے انحراف کیا تھا۔

مجھے یہ بتاؤ کہ اب تمہاری اس بات کا کیا مطلب ہوگا کہ "اکرم الناس" سب سے پہلے "اتقی" سے موصوف ہوتا ہے، پھر وہی قلیل التقوی ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہی اقل التقوی سے متصف کہلاتا ہے۔ یہ تمام خرابی اس لیے لازم آئی کہ "اتقی" کو محمول گردانا، لہذا یہ پاگل کی بڑ ہے کہ بولتا ہے اور سمجھتا نہیں۔

اگر ایسا مان لیا جائے تو تمہاری تعجب خیز گفتگو کی بنا پر کلام کی خرابی ان تمام احادیث کے معانی و مطالب کو گدلا کر دے گی جن میں ترتیب وار اعمال کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور یہ مضمون احادیث میں بہت ہے، جیسے:

حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کو تمام کاموں میں سب سے زیادہ پیاری چیز وہ نماز ہے جو وقت پر ادا کی جائے۔ پھر ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک۔ پھر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنا۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، اور امام نسائی نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

اس حدیث کے معنی تمہارے گمان کے مطابق تو یوں ہونا چاہیے کہ "أحب الأعمال" سب سے زیادہ محبوب کام پہلے "الصلوۃ" نماز سے موصوف ہوتا ہے اور صلاۃ اس کی صفت ہوتی ہے۔ پھر کچھ دیر بعد أحب الأعمال حسن سلوک ہو جاتا ہے، پھر تھوڑی دیر ٹھہر کر أحب الأعمال جہاد ہو جاتا ہے، یہ بات سب سے زیادہ عجیب باتوں میں سے ہے جو سننے والوں نے سنی۔

تذییل:

خبردار! یہ گمان نہ کرنا کہ ایسے مقامات میں خبر کو مقدم رکھنا کلام فصیح میں بہت کم ہے، لہذا حصول مقصد کی خاطر تاویل کی ضرورت پیش آئی ہے، نہیں بلکہ ایسا کلام میں بکثرت ہوتا ہے، بلکہ یہی طریقہ اکثر و بیشتر اپنایا جاتا ہے، اگر ہم تمہارے لیے اس طریقہ پر وارد احادیث نبویہ کا ذکر کریں تو ان کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر جائے گی، اور پھر تم مجھے اکتا دینے والا قرار

دوگے۔

پھرانہی مقامات میں سے وہ بھی ہے کہ خود احادیث میں ہماری مراد پر دلیل موجود ہے جیسے صفات کو مقدم اور ذوات کو مؤخر کرنا وغیرہ۔

اورانہی میں سے یہ بھی ہے کہ شارحین حدیث نے کسی حاجت کے بغیر احادیث کے اس طرح کے جملوں کی ترتیب الٹ دی (جس سے واضح ہوا کہ محکوم علیہ وہی ہے جو عبارت میں مؤخر ہے) لہٰذا معلوم ہوا کہ اخبار کو پہلے ذکر کرنا اسی طرح صفات کو بھی مقدم کرنا شائع وذائع ہے۔ بسا اوقات، کلام فصیح اس طریقہ پر جاری ہوتا اور لوگوں کا ذہن اس کی طرف سبقت کرتا ہے۔ بغیر اس کے کہ کسی قرینہ صارفہ کی حاجت ہو یا کسی رہنما کی رہنمائی پر اس کا سمجھنا مرتوف ہو۔

اگر ہمیں طوالت کا خوف نہ ہوتا تو ہم تمہیں ان طریقوں پر وارد احادیث کا عجیب وغریب نمونہ دکھاتے۔ پھر بھی اس میں کوئی حرج نہیں کہ ہم کچھ ایسی احادیث کا ذکر کردیں خصوصاً وہ احادیث جو قسم ثانی یعنی تقدیم صفات سے متعلق ہیں، کیوں کہ یہ ہمارے مقصد کے سلسلہ میں زیادہ واضح ہیں، سب سے پہلے ہم وہ حدیث ذکر کررہے ہیں جس میں مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے دو مقدمے ذکر فرمائے ہیں جن سے علمائے کرام نے ایک نتیجہ اخذ کیا جس طرح دونوں آیتوں سے ہم نے نتیجہ نکالا تھا، تا کہ ہمارا یہ طریقہ تمہاری غلط روش سے باز رکھے۔

پہلی حدیث:

ہمیں خبر دی حسین فاطمی نے، انھوں نے روایت کی عابد بن احمد سے، انھوں نے صالح فاروقی سے، انھوں نے سلیمان درعی سے، انھوں نے محمد شریف سے، انھوں نے شمس علقمی سے، انھوں نے امام سیوطی سے، انھوں نے احمد بن عبدالقادر بن طریق سے، انھوں نے کہا کہ ہمیں خبر دی ابو اسحاق تنوخی نے، انھوں نے کہا کہ ہمیں خبر دی ابوالحجاج یوسف بن مزی نے، انھوں نے کہا کہ ہمیں خبر دی فخر بن بخاری نے، انھوں نے اس حدیث کو سنا ابو حفص عمر بن طبرزد سے، انھوں نے کہا ہمیں خبر دی ابوالفتح عبدالملک بن ابی القاسم کروخی نے، انھوں

نے کہا ہمیں خبر دی قاضی ابو عامر محمود بن قاسم ازدی اور ابو بکر احمد بن عبد الصمد غورجی نے، انھوں نے کہا ہمیں خبر دی ابو محمد عبد الجبار جراحی مروزی نے، انھوں نے کہا خبر دی ہمیں امام ترمذی نے، انھوں نے کہا حدیث بیان کی ہم سے محمد بن یحییٰ نے، انھوں نے کہا خبر دی ہمیں محمد بن یوسف نے، انھوں نے کہا حدیث بیان کی ہم سے سفیان نے، انھوں نے ہشام بن عروہ سے، انھوں نے اپنے والد عروہ سے، انھوں نے ام المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں، جب تمہارا کوئی ساتھی مر جائے تو اس کی برائی بیان کرنے سے باز رہو۔ یہ حدیث حسن ہے۔

قلت : یہ حدیث سنن ابن ماجہ میں حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی مروی ہے، اسی طرح امام طبرانی نے معجم کبیر میں حضرت امیر معاویہ بن سفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے اس کو روایت کیا۔

امام سیوطی کی جامع صغیر کے شارح علامہ عبد الرؤف مناوی اپنی شرح تیسیر میں بطور شرح فرماتے ہیں: تو میں مطلقاً تم سے بہتر ہوں، اور حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی گھریلو حیات مبارکہ سب سے بہتر تھی۔

أقول : اے منکر! اگر تو اس حدیث میں ذکر شدہ قیاس میں اور اُس قیاس میں جس کا تو منکر ہے (کہ اتقی سب سے افضل) میں فرق واضح کر دے تو تفضیلی ہمیشہ تیرے شکر گزار رہیں گے۔ لیکن یہ بہت دور کی بات ہے، تم سے یہ کب ہو پائے گا۔

دوسری حدیث:

امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں، اور امام بخاری و امام مسلم نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اونٹوں پر سوار ہونے والی عورتوں میں سب سے بہتر قریش کی نیک اور پارسا عورتیں

ہیں:

شارح علامہ مناوی نے فرمایا: جن عورتوں کے سب سے بہتر ہونے کے بارے میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ قریشی عورتوں میں نیک عورتیں ہیں، مطلقاً ساری قریشی عورتوں کے لیے بہتر ہونے کا حکم نہ فرمایا۔

دیکھو شارح نے کس طرح ''خیر'' کو محکوم بہ بنایا۔

امام احمد بن حنبل، امام ترمذی، اور امام حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ساتھیوں میں سب سے بہتر اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ ہے جو اپنے ساتھی کے لیے بہتر ہو، اور پڑوسیوں میں اللہ تعالیٰ کے یہاں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے پڑوسی کے لیے بہتر ہو۔

فاضل شارح نے اس کی شرح میں فرمایا: تو ہر وہ شخص جو اپنے ساتھی کے لیے بھلائی میں سب سے زیادہ ہو وہی اللہ تعالیٰ کے یہاں افضل ہے۔ اور جو اس کے برعکس ہے وہ برعکس ہے۔

امام احمد بن حنبل، امام ابن حبان، اور امام بیہقی نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے بہتر ذکر پوشیدہ ذکر ہے۔

فاضل شارح نے فرمایا: یعنی جس ذکر کو ذاکر پوشیدہ رکھے اور لوگوں سے چھپائے وہ علانیہ ذکر سے بہتر ہے۔

امام طبرانی نے حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے زیادہ فضیلت والا صدقہ وہ ہے جو پوشیدہ طور پر فقیر کو دیا جائے۔

فاضل شارح نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

﴿ وَإِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ﴾ اور اگر تم صدقہ کو چھپاؤ اور پوشیدہ طور پر فقیروں کو دو تو یہ تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔

أقول: دیکھو! آیت کریمہ نے ''خیر'' کو جو موضوع ہے مؤخر کیا، اور حدیث میں

اس کو مقدم کیا۔

امام احمد بن حنبل، اور امام حاکم نے ایک صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک قربانی کے جانوروں میں سب سے زیادہ فضیلت والا سب سے قیمتی اور سب سے فربہ ہے۔

فاضل شارح نے فرمایا: تو جو سب سے فربہ ہے وہ عدد میں کثیر سے افضل ہے۔[مثلاً ایک فربہ دو لاغر سے بہتر ہے]

امام احمد بن حنبل، امام طبرانی معجم کبیر میں حضرت ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے راوی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: سب سے فضیلت والا عمل اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنا ہے، پھر جہاد، پھر مقبول حج دیگر اعمال سے افضل ہے۔

أقـــول: اس آخری کلمہ کو دیکھو کہ پہلے جملہ کو ''افضل'' سے شروع فرمایا، پھر دوسرے جملہ میں اس کو مؤخر کر دیا۔

ابو الحسن قزوینی اپنی امالی میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک سب سے زیادہ لوگوں کی تصدیق کرنے والا وہ ہے جس کی بات سب سے زیادہ سچی۔ اور لوگوں کو سب سے زیادہ جھوٹا بتانے والا وہ ہے جو اپنی بات میں سب سے بڑا جھوٹا ہو۔

فاضل شارح نے فرمایا: تو سچا آدمی دوسرے کے کلام کو سچائی پر محمول کرتا ہے، اس لیے کہ وہ جھوٹ کو برا جانتا ہے۔ اور جھوٹا ہر خبر دینے والے کو جھوٹا قرار دیتا ہے، اس لیے کہ جھوٹ اس کی عادت ہے۔

امام احمد بن حنبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ''کتاب الزھد'' میں حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے موقوفاً روایت بیان فرمائی۔ اور ابن لال و ابن نجار نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مرفوعاً روایت کی۔ اور سجزی نے ''ابانہ'' میں حضرت عبد اللہ بن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بھی مرفوعاً بیان کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: لوگوں میں سب سے زیادہ گناہوں والا قیامت کے دن وہ شخص ہوگا جس نے دنیا میں لایعنی

باتیں کی ہوں گی۔

فاضل شارح نے فرمایا: اس لیے کہ جس کی باتیں زیادہ ہوں گی تو اس میں مہمل خلاف شرع باتیں بھی زیادہ ہوں گی، تو اس کے گناہ بھی غیر شعوری طور پر زیادہ ہوں گے۔

امام بخاری نے تاریخ، امام ترمذی اور امام ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک لوگوں میں سب سے زیادہ مجھ سے قریب قیامت کے دن وہ ہوگا جس نے مجھ پر سب سے زیادہ درود پڑھا ہوگا۔

فاضل شارح فرماتے ہیں؛ یعنی قیامت کے دن لوگوں میں مجھ سے زیادہ قریب اور میری شفاعت کا سب سے زیادہ حق دار وہ ہوگا جس نے دنیا میں سب سے زیادہ مجھ پر درود پڑھا ہوگا۔ اس لیے کہ درود پاک کی کثرت حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے سچی محبت اور کمال ربط کی علامت ہے، لہٰذا لوگوں کے مراتب رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے قرب میں درود پاک کے تفاوت اور فرق کے اعتبار سے ہوں گے۔

أقول: دیکھو! پہلے لفظ حدیث کی شرح کی، پھر اس کا سبب اس انداز سے بیان کیا کہ پہلے لفظ کو محکوم بہ بنائے بغیر وہ معنی درست ہی نہیں ہو سکتے۔ اور اس سے زیادہ واضح دلیل ہمارے دعوی پر یہ ہے کہ علمائے محدثین، اللہ تعالیٰ ہم کو ان کی برکات کا فیضان عطا فرمائے، نے اس حدیث سے محدثین کرام کی فضیلت پر استدلال فرمایا اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ قریب بتایا، اس لیے کہ یہ حضرات دوسرے لوگوں کی بہ نسبت حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ پر زیادہ درود پڑھتے ہیں۔

کیوں کہ جب بھی کوئی حدیث ذکر کرتے ہیں تو حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر دس مرتبہ۔ یا۔ پانچ۔ یا۔ دو، یا۔ کم از کم ایک مرتبہ ضرور درود پاک پڑھتے ہیں، جیسا کہ بخوبی معلوم ہے اور مشاہدہ ہے۔ والحمد للہ۔

تم مجھے بتاؤ کہ کیا یہ استدلال ہمارے اس احتجاج کے بالکل عین مطابق نہیں جو ہم نے دونوں آیتوں سے کیا۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا پورا پورا انعام یہ ہے کہ خود حدیث میں جس کو امام بیہقی نے ثقہ راویوں کی سند سے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا، اس میں وہ سب کچھ ہے جو ہم نے استدلال میں ذکر کیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پاک پڑھا کرو، اس لیے کہ ہر جمعہ کو میری امت کا سلام مجھ پر پیش ہوتا ہے، تو جو شخص امتیوں میں مجھ پر سب سے زیادہ درود پاک پڑھے گا وہ مجھ سے درجہ میں زیادہ قریب ہوگا۔

اس حدیث پاک سے معلوم ہو گیا کہ اس طرح کے مقامات میں تقدیم وتاخیر کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی، اس لیے کہ ان مقامات میں التباس کا کوئی خطرہ نہیں۔

اس نہج پر کلام کو ذکر کرنے میں راز وہی ہے جو ہم نے پہلے ذکر کر دیا کہ یہ احکام شرعیہ ہیں، اور ان سے واقفیت شارع علیہ السلام کی اطلاع کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہی اس قابل ہیں کہ ان کو محمول قرار دیا جائے، پھر یہ بھی آپ نے دیکھ لیا کہ ان مقامات پر ذہن بھی انہی معنی کی طرف سبقت کرتا ہے خواہ آپ محکوم بہ کو مقدم ذکر کریں یا مؤخر، یہ تمام باتیں نہایت واضح ہیں، یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بدیہی اولی ہیں، اس کا انکار جاہل بے عقل، یا خود جاہل بننے والا معاند ہی کر سکتا ہے۔

اس مقام پر دلائل کو کثرت سے ذکر کرنے کی وجہ سے ہمیں یہ خوف بھی لاحق ہے کہ کہیں علمائے کرام کے نزدیک ان دلائل کو قائم کرنا عبث اور بے کار کاموں میں مشغول ہونا نہ شمار ہونے لگے، اس لیے کہ ان کے کان اس طرح کے ہزارہا محاورات سے بھرے ہوئے ہیں، اور وہ کلام کے اسلوب سے بخوبی واقف اور مقصود کے طریقوں کو بیان کرنے کی راہوں سے آگاہ ہیں۔ لہذا وہ اس چیز سے بہت دور ہیں کہ ان کو محمول وموضوع کے درمیان تمیز دشوار ہو اور ان کے قلوب میں اس طرح کے خدشات جگہ پائیں۔ لیکن میں ان کی خدمت میں معذرت کرتا ہوں، اور میرا عذر ان کی بارگاہ میں واضح ہے (ان شاء اللہ تعالیٰ) کیوں کہ میری اور ان لوگوں کی مثال جو میری بات نہیں مانتے ایسی ہے جیسے وہ اونٹ جو اپنے مالک سے چھوٹ کر بھاگ کھڑے ہوں، اب وہ ان کا پیچھا کرتا ہے اور ان کو پکڑنے کے ارادہ سے دوڑتا ہے، اب

وہ خواہ کسی بلندی پر چڑھیں یا کسی وادی اور نالہ میں اتریں ہر حال میں وہ ان کے تعاقب میں ہے۔

تکمیل:

ان تمام مثالوں اور نظیروں سے تمہارے نزدیک یہ بات ظاہر ہوگئی کہ نحویوں نے جو یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ مبتدا و خبر جب معرفہ ہوں یا دونوں مصداق میں مساوی ہوں تو مبتدا کو خبر پر مقدم کرنا واجب ہے۔ یہ قاعدہ اکثری ہے کلی نہیں۔ یہ حکم بھی التباس کے اندیشہ کے وقت ہے، جب التباس نہیں تو یہ حکم بھی نہیں، شارحین اس کی صراحت کر چکے ہیں۔

اور تمہیں اس بات سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے کہ فن نحو میں متون کی کتابوں میں یہ قاعدہ علی الاطلاق ذکر کیا گیا ہے اور وہاں کوئی اس طرح کی قید نہیں، اس لیے کہ بسا اوقات علم فقہ کی کتابوں میں بھی مسئلہ مطلق لکھ دیا جاتا ہے حالانکہ وہ کسی قید سے مقید ہوتا ہے، پھر دوسرے فنون کا کیا حال ہوگا۔ (اس سلسلہ میں شواہد اور مثالیں ملاحظہ کیجیے)

خبر دی ہمیں مفتی حرم نے ابن عمر سے، انھوں نے زبیدی سے، انھوں نے یوسف مزجاجی سے، انھوں نے اپنے والد محمد بن علاء الدین سے، انھوں نے حسن عجیمی سے، انھوں نے علامہ خیر الدین رملی سے، انھوں نے ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ غزی تمرتاشی مصنف "تنویر الابصار" سے، انھوں نے "منح الغفار" میں فرمایا:

علم فقہ میں متن تحریر فرمانے والے ائمہ کرام پر تعجب ہے کہ وہ اپنے متون میں ایسی قیود چھوڑ دیتے ہیں جو ضروری ہوتی ہیں حالانکہ یہ متون مذہب فقہی کو نقل کرنے کے لیے تحریر کیے گئے ہیں، لہذا قید سے خالی ان مسائل کو جب کوئی دیکھتا ہے اور ان کو وہ ایسا ہی خیال کرتا ہے تو علی الاطلاق حکم لگا دیتا ہے حالانکہ وہ مسئلہ مقید ہوتا ہے، اس طرح وہ افتا و قضا کے بہت سے مسائل میں غلطی کا مرتکب ہوتا ہے۔

خبر دی ہمیں سراج نے مذکورہ بالا سند سے علامہ غزی تمرتاشی تک، انھوں نے علامہ زین بن نجیم مصری سے، انھوں نے "البحر الرائق" میں فرمایا: ان فقہائے کرام کا مقصد مسائل کو بعض اوقات علی الاطلاق چھوڑنے سے یہ ہے کہ اس علم فقہ کو جاننے کا دعوی وہی کرے جس نے ماہرین فقہ اساتذہ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور یہ بھی بتانا ہے کہ یہ علم متعلقہ کتب کی

طرف کثرت مراجعت، عبارات کی تلاش وجستجو اور مشائخ کرام سے استفسار کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔

أقــول: بقسم بخدا! میں نے ان اقوال کی تصدیق بہت سے ابنائے زمان کے حالات سے کی جنہیں علم فقہ میں صدارت کا دعوی، اور فتوی دینے کی دھن سوار ہے، حالانکہ ان کے پاس وہ علم نہیں جس کی روشنی میں وہ حد سے تجاوز نہ کریں۔

لہذا بہت سے لوگوں نے غلط فتوے دے ڈالے۔

ان میں سے ایک فتوٰی یہ ہے کہ نکاح فاسد کی بنیاد پر بھی منکوحہ کو ترکہ کا وارث قرار دے دیا۔

دوسرا یہ ہے کہ نابالغہ لڑکی کا نکاح اگر ماں نے کر دیا اور چچا باحیات تھا مگر مجلس نکاح میں حاضر نہ تھا تو اس نکاح کو باطل قرار دے دیا، حالانکہ یہ باطل نہیں بلکہ موقوف ہے۔

تیسرا یہ کہ وہ عورت جو اپنی بہن کی عدت میں شادی کرے تو اسے طے شدہ مہر ملے گا۔

چوتھا یہ کہ کرنسی نوٹ کی لکھی ہوئی رقم سے کم یا زائد پر اس کو فروخت کرنا حرام ہے، وجہ یہ بتائی کہ یہ سود ہے حالاں کہ نہ جنس میں اتحاد ہے اور نہ قدر میں۔

پانچواں یہ ہے کہ ہندی کافروں سے سود لینا جائز ہے، یہ اس گمان پر جائز کہا کہ ہندوستان دار الحرب ہے، حالاں کہ یہ دار الاسلام ہے کہ نہ تو یہ ملک ہر طرف سے اسلامی ممالک سے کٹا ہوا ہے، اور نہ ہی اسلامی شعائر پر پابندی، بلکہ بہت سے اسلامی شعائر بلا شبہ جاری ہیں۔

چھٹا یہ کہ زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے تو اس کا کھانا حلال ہے، اس مسئلہ کو "ہدایہ" کی اس عبارت سے اخذ کیا "اور جو عضو جدا کیا گیا وہ زندہ کا ہے، اور اگر وہ مردہ ہے تو اس کا مردار بھی حلال ہے"۔

یہاں تک کہ فتوٰی کی ریاست اور سیادت کبرٰی اس شخص تک پہونچ گئی جس نے رضاعی بھائی کی بیٹی سے نکاح جائز کر دیا۔ اور دوسرے مجتہد وقت نے تو آگے بڑھ کر سگی پھوپھی سے بھی نکاح کو جائز قرار دے دیا۔ تو اللہ تعالٰی کی بارگاہ میں ہی زمانہ کے اس فساد کی

فریاد ہے۔ ولا حول ولا قوة الا باللّٰه العلي العظیم۔

جلد ہی وہ حضرات بھی ان تمام چیزوں کو جان لیں گے جو میرے جیسا تجربہ کریں، میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ میرے قلب کو پاک فرمائے، زبان کو درست رکھے، اور میرے ہاتھ کو سیدھا رکھے۔ اسی سے میری حفاظت اور اسی پر میرا بھروسہ ہے۔ آمین۔

اب شاید تم یہ کہو کہ آپ نے مذکورہ مسئلہ کے چہرے سے نقاب اٹھا دی اور حجاب دور کر دیا۔ لہذا اب مجھے یہ بتائیے کہ خبر کو مقدم کرنے میں کیا نکتہ ہے حالانکہ اس کا مقام تو مبتدا کے بعد ہی ہے۔

قلت: میں کہتا ہوں اس میں انوکھے نکتے ہیں:

اول: یہ ہے کہ جب محکوم بہ یعنی خبر پوشیدہ ہو اور محکوم علیہ یعنی مبتدا کا ادراک ظاہر و باہر ہو تو پہلا معرف (یعنی جس کی تعریف اور پہچان کرائی جاتی ہے) کے مشابہ ہوا اور دوسرا تعریف کے مشابہ، لہذا خبر کو مقدم کرنا مستحسن ٹھہرا تا کہ دوسرا کلمہ اس کے لیے بہ منزلۂ تعریف قرار پائے۔

دوم: یہ ہے کہ سننے والے کو شوق دلانا مقصود ہے، کیوں کہ قلوب انجانی چیز کو جاننے کے لیے لپکتے ہیں، لہذا جب وہ ایسی چیز کو سنیں جس میں کوئی پوشیدگی ہو اور ان کو اس بات کی امید رہے کہ اب اس چیز کا ذکر ہونے والا ہے جس سے اس پوشیدہ چیز کا ظہور ہو تو وہ کان لگا کر سننے کے لیے متوجہ ہو جائیں گے اور جاننے کے لیے اپنے آپ کو ہر طرف سے فارغ کر لیں گے۔ اس طریقہ سے بات پورے طور پر دل میں جم جائے گی اور نفس کا اس کی طرف خوب میلان رہے گا اور حاصل ہو جانے سے سکون واطمینان حاصل ہو جائے گا۔

سوم: یہ ہے کہ شریعت میں اعمال اپنی ذات کے لیے مقصود نہیں ہوتے بلکہ وہ ثمرات اور نتائج مقصود ہوتے ہیں جو ان اعمال پر مرتب ہوتے ہیں، لہذا ثمرات ہی مقاصد قرار پائے، اور مقاصد کا حق یہ ہے کہ وہ دوسروں پر مقدم ہوں۔

ان کے علاوہ اور بھی نکتے ہیں جو ارباب دانش پر پوشیدہ نہیں۔ اور ہم نے جو نکتے ذکر کیے وہ طویل گفتگو سے بے نیاز کرنے کے لیے کافی ہیں۔ والحمد للّٰہ رب

العالمین۔ یہ سب جود وکرم والے مولیٰ کی عطا سے ہے۔

اب واضح ہو گیا کہ میں نے سچ کہا تھا کہ اس معترض کو نہ نصوص کے طرز گفتگو کی خبر ہے، نہ اس بارے میں اسباب نزول کا علم، نہ سرکار کی حدیث مرفوع سے آگاہی، نہ علما وائمہ کی تصریحات کا، اور دوسری کارآمد باتوں کا پتا۔ والحمد للہ جل وعلا۔

وجہ ثانی: اس شبہ کے جواب کی دوسری وجہ یہ ہے:

أقول بتوفیق الوھاب: اگر ہم عکس کے معاملہ پر آئیں اور بحث کو آخری حد تک پہنچائیں تو تمھیں یہ چھوٹ نہ دیں گے کہ کہتے پھرو کہ آیت اتقی کی اکرمیت وافضلیت کی مقتضی نہیں، اگرچہ ہم یہ تسلیم کرلیں کہ موضوع اتقی نہیں، اکرم ہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''أتقاکم'' اور ''أکرمکم'' (میں ''اتقی'' اور ''اکرم'' اسم تفضیل کے صیغے ہیں جن کا مصداق افراد مضاف الیہ میں سے صرف وہ فرد ہوگا جو تقویٰ اور کرامت میں سب سے بڑھا ہوا ہو۔ اس لیے ان) کا مصداق ایک ہی ذات ہوگی، بلکہ یہ ایک ذات کے علاوہ پر صدق کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے اور ان میں تعدد ممکن ہی نہیں، بایں معنی کہ کبھی اِس پر صادق آئیں، اور کبھی اُس پر۔ تو جب وجود میں ان دونوں کا اتحاد ثابت ہو گیا جیسا کہ حمل کا تقاضا ہے، تو دونوں کا باہم عکس بھی ضروری ہوا، اس لیے کہ جب دونوں کا مصداق متحد اور تعدد کا بطلان معلوم، تو گویا یہ دونوں ایک ذات کے علم ہو گئے۔ تمھیں اختیار ہے کہ جس کو چاہو ذات کے لیے مرآۃ ملاحظہ (یعنی موضوع کا وصف عنوانی) بناؤ اور جس کو چاہو محمول بناؤ۔ اس کی بہت نظیریں اور مثالیں کلام میں پائی جاتی ہیں۔ جیسے تم کہتے ہو:

☆ سب نبیوں سے افضل وہ ہیں جو سب سے پہلے پیدا کیے گئے۔

☆ سب رسولوں سے افضل وہ ہیں جو سب کے بعد مبعوث ہوئے۔

☆ سب جنتوں سے بہتر وہ جنت ہے جو سب سے زیادہ عرش سے قریب ہے۔

☆ سب سے بڑا پیڑ جنت میں طوبیٰ ہے۔

☆ جبرئیل علیہ السلام کا منتہی سدرۃ المنتہیٰ ہے۔

☆ نمازوں میں سب سے زیادہ فضیلت والی نماز درمیانی نماز ہے۔

☆تمہارا باپ اس کا باپ ہے۔

☆تمہاری ماں اس کی ماں ہے۔

☆سب سے پہلے داخل ہونے والا سب کے بعد نکلنے والا ہے۔

☆عدد میں سب سے کم تر پہلا عدد ہے۔

☆سورج نیرِ اعظم ہے۔

☆سب سے اونچا آسمان حجم میں سب سے بڑا ہے۔

☆سب سے خاص کلی سب سے کم افراد والی ہے۔

☆فلک جوز ہر فلک قمر ہے۔

☆وہ سیارہ جس میں تدویر نہیں، سورج ہے۔

☆سیارہ متحیر سیارہ زحل ہے۔

☆سیدھے چل کر الٹا پھرنے والا اور غائب ہو جانے والا سرخ سیارہ مریخ ہے۔

[ان سب جملوں میں جسے موضوع بنایا ہے اسے محمول، اور جسے محمول بنایا ہے اسے موضوع بنا سکتے ہو، اور قضیہ دونوں حال میں صادق اور عکس صحیح رہے گا]

ان کے علاوہ اور بھی مثالیں ہیں جن کا شمار نہیں۔ یاد رہے کہ تم کوئی ایسی مثال نہیں لا سکتے جس میں ''افعل مضاف'' (۱) محمول ہو دوسرے ''افعل مضاف'' پر جس کی اضافت اسی کی جانب ہو جس کی جانب پہلے افعل کی اضافت ہے اور دونوں افعل اپنے حقیقی معنی پر جاری ہوں پھر ایسے جملے کا عکس صحیح نہ ہو، یعنی مندرجہ ذیل شرطیں موجود ہوں اور اس مثال کا عکس درست نہ ہو:

(۱) دو اسم تفضیل ہوں اور دونوں مضاف ہوں (۲) دونوں کا مضاف الیہ ایک ہو

(۳) دونوں اپنے حقیقی معنی پر جاری ہوں (۴) دونوں میں سے ایک موضوع ہو اور دوسرا اس پر محمول ہو

---

(۱) افعل کے ساتھ مضاف کی قید اس افعل سے احتراز کے لیے جو ''من'' کے ساتھ استعمال ہو، اس لیے کہ ''افضل من قوم'' (کسی قوم کی بہ نسبت افضل) کا مصداق متعدد ہو سکتا ہے، جیسے ہر نبی، صحابہ سے افضل ہیں۔ اور ''افضل القوم'' (قوم میں سب سے زیادہ فضل والا) متعدد نہیں ہو سکتا جیسے ہم اہل سنت کا قول ''افضل الصحابہ'' (صحابہ میں سب سے زیادہ فضیلت والا) کہ اس کا مصداق حضرت ابو بکر کے سوا کوئی نہیں۔ ۱۲ منہ

اس تفصیل کی روشنی میں جب واقع کی طرف نظر کرتے ہوئے قضیہ اور عکس قضیہ صادق ہوگا تو ہمیں قیاس کی ترتیب دینے اور مدعا کا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے یہی کافی ہے، [اگر چہ اہل منطق کے نزدیک قاعدہ مقررہ یہ ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ نہیں آتا بلکہ موجبہ جزئیہ آتا ہے، جو شکل اول کا کبریٰ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا] اس میں راز یہ ہے کہ قضیہ موجبہ کا عکس وہ قضیہ (یعنی موجبہ جزئیہ) آتا ہے جو شکل اول کا کبریٰ بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا، کیونکہ قضیہ میں محمول عام بھی ہوسکتا ہے۔ اور جب وہاں دو مفہوم ایسے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کا مصداق ایک ہی ذات ہے ظرف خارج کے اعتبار سے۔ یا ظرف خارج و ذہن دونوں کے اعتبار سے، تو اب ان میں سے ہر ایک کا عام ہونا اس ظرف (خارج یا خارج و ذہن) کے اعتبار سے باطل ٹھہرا، لہذا اب یہ نہیں ہوسکتا کہ دونوں میں سے ایک دوسرے سے اعم ہو، بایں معنیٰ کہ اس ظرف (خارج یا خارج و ذہن دونوں) میں اسے بھی شامل ہو اور اس کے علاوہ کو بھی شامل ہو، ایک عام ہے بایں معنیٰ کہ وہ اس کو اور اس کے غیر کو خارجی یا ذہنی اعتبار سے شامل ہے۔ تو اب ان دونوں کے درمیان یا تو تساوی کی نسبت ہوگی یا تباین کی [دونوں میں سے ہر ایک، دوسرے کے تمام افراد پر صادق ہوگا، یا دونوں میں کوئی بھی دوسرے کے کسی فرد پر صادق نہ ہوگا]، ان کے لیے تیسری کوئی صورت نہیں، لہذا اگر یہ قضیہ حملیہ صادق ہو کہ "ذلك هـذا" (وہ یہ ہے) تو ضروری ہے کہ یہ قضیہ بھی صادق ہو کہ "هـذا ذاك" (یہ وہ ہے) ورنہ سلب ضرور جائز ہوگا اور یہ دونوں متباین ہو جائیں گے، پھر تو پہلا قضیہ بھی باطل ٹھہرے گا، جب کہ فرض یہ کیا گیا کہ پہلا صادق ہے تو خلاف مفروض لازم آئے گا۔

(اس کی وضاحت یوں ہوسکتی ہے) کسی شخص کے دو قول ہم تک پہنچے، ان میں سے ایک یہ کہ اس نے عمرو سے مخاطب ہو کر کہا: "زید تیرا باپ ہے" دوسرا قول یہ کہ "میرا باپ تیرا باپ ہے" اب ہم ان دونوں سے ایک شکل بنا سکتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا "زید میرا باپ ہے" اس لیے کہ جب اس کا یہ قول صادق آیا کہ "میرا باپ تیرا باپ ہے" تو لازم ہے کہ یہ بھی صادق ہو کہ "تیرا باپ میرا باپ ہے" ورنہ ان دونوں کے باپ متعدد ہوں گے تو پہلا قضیہ باطل ٹھہرے گا، اور جب یہ قضیہ صادق ہے تو اب شکل اس طور پر بنے گی "زید تیرا باپ ہے۔ اور۔

تیرا باپ میرا باپ ہے۔تو۔زید میرا باپ ہے''۔

واضح رہے کہ اسم تفضیل جب ایک جماعت کی طرف مضاف ہو اور اپنے معنی حقیقی پر باقی ہو جو اس سے متبادر اور مفہوم ہوتے ہیں تو اس کی شان یہی ہوتی ہے۔اس لیے کہ کسی بھی جماعت میں فرد اکمل ایک ہی ہوسکتا ہے،اور کبھی ایسے دو قضیے ساتھ ساتھ صادق نہیں ہوسکتے جن میں یہ دعویٰ ہو کہ ''یہ ساری جماعت میں اکمل ہے۔اور وہ بھی ساری جماعت میں اکمل ہے''۔

یہ حقیقت بہت واضح ہے، بلکہ اس کا حال سورج اور اس کے مثل دوسرے سیاروں سے بھی زیادہ روشن ہے۔اس لیے کہ عقل اس بات کو جائز رکھتی ہے کہ شمس کا مفہوم بہت سے افراد پر صادق آئے،اور خارج میں جب ایک فرد ہے تو دوسرے فرد کا وجود عقلاً مستبعد نہیں،اس کے بر خلاف صیغۂ اسم تفضیل جب کسی جماعت کی طرف مضاف ہو تو یہ قابل اشتراک نہیں ہوتا مگر بطور بدلیت،اور جب خارج میں اس کا مصداق ایک فرد معین ہو جائے تو اب اس سے الگ کسی دوسرے پر اس کا صادق آنا عقلاً محال ہوگا،اس کا حال ٹھیک اسمائے اشارات کی طرح ہے برابر برابر، (یعنی جس طرح اسمائے اشارات اپنے مشار الیہم پر علی سبیل البدلیت صادق آتے ہیں اور جب خارج میں ایک مشار الیہ متعین ہو گیا تو اس وقت کوئی دوسرا اس کا مصداق نہیں ہوسکتا ہے)

لہٰذا یہاں پر عکس کا صادق آنا زیادہ روشن اور ظاہر وباہر ہے،رہی یہ بات کہ مناطقہ نے تو یہ کہا ہے کہ ''قضیہ موجبہ کا عکس جزئیہ ہی آتا ہے۔'' تو اس کا مطلب یہ سمجھنا کہ ''جب بھی تم موجبہ کلیہ کے موضوع کو محمول اور محمول کو موضوع قرار دو اور کلیہ کا سور لاؤ تو قضیہ جھوٹا ہی ہو'' بالکل واقع کے خلاف ہے، بلکہ مناطقہ کا مطلب صرف اتنا ہے کہ موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ آئے یہ حکم مطرد نہیں [یعنی ہر مادے میں یہ عکس صادق نہ آئے گا اور موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ جزئیہ ہر مادے میں صادق آئے گا]، چونکہ ان کی نظر کلیات پر مرکوز رہتی ہے،لہٰذا یہ لوگ اسی مفہوم کا اعتبار کرتے ہیں جو مطرد اور عام ہو، کسی بھی مادہ میں اس کے خلاف نہ ہو۔

واضح رہے کہ عدم اطراد (ہر مادے میں عام نہ ہونا) اطراد عدم (نہ ہونے کے عموم) کو مستلزم نہیں، [یعنی ان کے قول ''موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ ہر مادے میں صادق نہیں آتا'' کا یہ مطلب نہیں کہ کسی بھی مادے میں موجبہ کلیہ کا عکس موجبہ کلیہ صادق نہیں آتا] اور ہم یہ بھی نہیں

کہتے کہ یہ جو ہم نے بیان کیا یہ عکس منطقی ہے، اور ہمارا یہ بھی دعوی نہیں کہ عام طور پر یہ قضیہ کے لیے لازم ہے، ہاں البتہ یہ ضرور ہے کہ جس نوعیت کے مقام اور کلام میں ہماری گفتگو چل رہی ہے اس میں بلا شبہ عکس لازم اور قضیہ واقع کی طرف نظر کرتے ہوئے صادق، اہل منطق اسے عکس کا نام دیں یا نہ دیں۔ بس اتنی ہی بات شکل کی ترتیب کے لئے کافی ہے، کیوں کہ جب بھی دو قضیے صادق اور شرائط کے جامع ہوں تو ان کا نتیجہ بھی صادق ہی ہوگا۔

خیال رہے کہ صدق قضیہ کا اثبات خاص اسی طور پر لازم نہیں کہ وہ فلاں قضیۂ صادقہ کا ''عکس منطقی'' ہے اس کا انکار بدترین مکابرہ ہے۔

پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اس عکس کی طرف ہماری رہنمائی آیت کریمہ نے ہی کی ہے، اس لیے کہ اسی نے ہمیں یہ راستہ دکھایا کہ دونوں قضیے وجود میں متحد ہیں، تو جب یہ اتحاد ایسے دو مفہوموں میں ہے جن میں سے کسی کا مصداق متعدد نہیں تو بلا شبہ یہ دونوں قضیوں کے باہم منعکس ہونے کی طرف رہنمائی ہے، جیسے تم نے کسی کو کہتے سنا کہ ''میرا باپ زید ہے'' تو تم بیان کر سکتے ہو کہ ایک شخص کہہ رہا تھا کہ ''زید میرا باپ ہے'' اس لیے کہ زید متعدد نہیں، اور مرد کا باپ بھی متعدد نہیں، لہذا جب اس کا باپ زید ہوگا، تو یہ بھی کہنا درست ہوگا کہ زید اس کا باپ ہے۔ یہاں (اکرم و اتقی میں) بھی بالکل وہی معاملہ ہے، جس میں شک وشبہ نہیں۔ والحمد لله على نعماه۔ اور اے فلسفی! اب اپنے وسوسوں کی حرکت روک اور ان کی گردش میں نہ رہ۔

وجہ ثالث: اس شبہ کے جواب کی تیسری وجہ یہ ہے:

أقول وربي هادي الصواب: ہم نے ان تمام باتوں سے صرف نظر کر کے مان لیا کہ آیت اولیٰ کا مفاد یہ ہے کہ ''ہر اکرم اتقی ہے'' اور اس کا عکس نقیض یوں ہے کہ ''جو اتقی نہیں اکرم نہیں'' اور اس سے پہلے ہم اعلی تحقیق سے یہ بات ثابت کر آئے کہ آیت ثانیہ ﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْأَتْقَى﴾ میں اتقی سے مراد وہ ہیں جو تمام صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے اتقی ہوں، لہذا ضروری ہے کہ کوئی صحابی نہ ان سے اتقی ہو اور نہ کوئی تقوی میں ان کے برابر ہو، جب یہ ثابت ہو چکا تو اب ہم کہتے ہیں:

''كل صحابي فهو ليس بأتقى من أبي بكر''

(ہر وہ جو صحابی ہے تو وہ ابو بکر سے اتقی نہیں)

''ومن ليس بأتقى منه ليس بأكرم منه''

(اور جو ان سے اتقی نہیں وہ ان سے اکرم نہیں)

نتیجہ یہ نکلا: ''كل صحابي فهو ليس بأكرم من أبي بكر''

(ہر وہ جو صحابی ہے تو وہ ابو بکر سے اکرم نہیں)

اس قیاس میں صغری معدولہ ہے جیسا کہ ہم نے حرف سلب (لیس) پر اداۃ ربط (ھو) کو مقدم کر کے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ہاں تمہیں یہ بھی اختیار ہے کہ تم اس قضیہ کو سالبۃ المحمول بنا دو۔ یعنی متاخرین میں سے بعض کے قول کے مطابق۔

تمہارا وہم دور کرنے کے لیے تمہاری رہنمائی اس طرح ہوگی کہ کبری میں سلب کو حد اوسط کے افراد کے لیے مرأۃ ملاحظہ بنایا جائے، اور چاہو تو تم پہلی آیت کا بھی عکس نہ کرو، اور شکل ثانی کے طریقہ پر قیاس کو اس طرح ترتیب دو، ''کوئی صحابی ابو بکر سے اتقی نہیں''۔ اور۔ ''ہر وہ جو ابو بکر سے اکرم ہے ان سے اتقی ہے'' اب نتیجہ یہ نکلے گا ''کوئی صحابی ابو بکر سے اکرم نہیں'' چاہو تو یہی مدعا ایک ایسے قیاس استثنائی سے ثابت کرو جس میں رفع تالی کے سبب رفع مقدم ہو۔ وہ قیاس استثنائی اس طرح ہوگا: ''اگر امت میں کوئی صدیق اکبر سے اکرم ہوگا تو وہ صدیق اکبر سے اتقی بھی ہوگا'' اس لیے کہ ہر اکرم اتقی ہے، ''لیکن امت میں کوئی بھی صدیق اکبر سے اتقی نہیں'' آیت ثانیہ اس پر گواہ ہے۔ تو نتیجہ یہ نکلا کہ ''امت میں کوئی بھی صدیق اکبر سے اکرم نہیں''۔ یہی ہمارا مقصود تھا۔

تنبیہ:

اب بے وقوف لوگ کہیں گے کہ کس چیز نے تمہیں تمہارے اس دعوے سے پھیر دیا جس پر تم تھے۔ کیوں کہ ان آخری تین صورتوں میں تو صدیق اکبر سے کسی دوسرے کے اکرم ہونے کی نفی ہے، اور یہ اس بات کو مستلزم نہیں کہ صدیق اکبر اکرم ہی ہوں، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ اور دوسرے فضیلت میں برابر ہوں۔

أقول: تو کیا واقعی ان بے وقوفوں نے یہ بات کہی؟ اگر کہی ہے تو واقعی یہ ان کی کج

روی ہے۔

أمـا اولاً: نصوص شریعت اور محاورات اہل بلاغت اس بات سے بھرے ہوتے ہیں کہ کلام کو کسی کی فضیلت مطلقہ بتانے کے لیے اسی انداز پر لایا جاتا ہے، کہتے ہیں: کوئی فلاں سے افضل نہیں، مراد یہی ہوتی ہے کہ وہ سب سے افضل ہے۔ ایسا اس لیے کرتے ہیں کہ حقیقی تساوی گویا محال عادی ہے، اس سلسلہ میں شارحین حدیث کے کلام کا مطالعہ تم پر لازم ہے۔

و أمـا ثـانيـاً: تساوی کو باطل ٹھہرانے اور افضلیت کو ثابت کرنے کے لئے تم چاہو تو اس کے ساتھ امت کا اجماع ضم کردو، اس لیے کہ حق ان کے اقوال سے خارج نہیں ہوسکتا۔

و أما ثالثاً: (یہی جواب شان دار، زوردار ہے) کہ کلام کے اسلوب کو پہچاننے والا پہلی آیت کریمہ سے سمجھتا ہے کہ تقوی ہی فضیلت کا سبب ہے، اور فضیلت کا حصول تقوی کے حصول میں منحصر ہے، اس کی تصریح ان احادیث مبارکہ نے فرمائی جو اس آیت کریمہ کی دلالت وہدایت سے رونما ہوئیں اور جن کا مطمح نظر وہی ہے جو آیت کریمہ کا ہے۔

ہمیں خبر دی سراج الحنفیہ نے اپنی سند سے، انھوں نے روایت کی شریف سے، انھوں نے محمد بن ارکماش سے، انھوں نے علامہ ابن حجر عسقلانی سے، انہوں نے عبدالرحمن بن احمد بن مبارک غزی سے، انہوں نے احمد بن ابی طالب حجار سے، انھوں علی بن اسمعیل بن قریش سے، انھوں نے حافظ منذری سے کہ انھوں نے "کتاب الترغیب والترہیب" میں حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: بے شک تمہارے یہ نسب کسی کے لیے گالی نہیں، تم تو آدم علیہ السلام کی اولاد ہو پیمانہ کے دانوں کی طرح (جن کو تم نے نہیں بھرا) کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر دین یا عمل صالح کی وجہ سے۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل اور امام بیہقی نے روایت کیا، یہ دونوں حضرات ابن لهیعہ کی روایت سے بیان کرتے ہیں۔

امام بیہقی کے الفاظ یہ ہیں: کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر دین یا عمل صالح کے سبب، اور آدمی کے برا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ بدزبان اور کنجوس ہو۔

ایک روایت میں امام بیہقی کے یہاں یہ بھی ہے کہ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر دین یا

تقوی سے، اور آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ بدگو، بے حیا اور کنجوس ہو۔

حدیث پاک میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان ''طف الصاع'' اضافت کے ساتھ، اس کا معنی ہے کہ تم میں سے بعض بعض کے قریب ہے۔ انتھی۔

قلت: اس حدیث کی تخریج امام طبرانی نے بھی ایک حدیث طویل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے طریق سے کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: تم لوگ تو ایک مرد وعورت سے ہو جُمام صاع کی طرح۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقوی سے۔ انتھی۔

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ''جُمام الصاع'' جیم کے ضمہ کے ساتھ، وہ چیز جو پیمانہ میں بھری جاتی ہے، اور معنی یہ ہے کہ تم قدر و منزلت میں ایک دوسرے کے برابر ہو پیمانہ میں بھرے ہوئے دانوں کی طرح، ناپنے سے ان کی مقدار معلوم ہو جاتی ہے اور ویسے دوسرے دانوں سے ناپ میں ان کی برابری بھی معلوم ہو جاتی ہے اور انہیں تولنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے کہ وزن اور موٹائی میں وہ برابر ہوتے ہیں۔

اسی مضمون کو امام منذری نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: دیکھو! تم کالے اور سرخ سے بہتر نہیں، مگر یہ کہ تم اس پر تقوی کی وجہ سے فضیلت پاؤ۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے روایت کیا، اور اس کے راوی ثقہ معروف ہیں مگر یہ کہ بکر بن عبداللہ مزنی کو حضرت ابوذر سے سماع حاصل نہیں۔ انتھی۔

قلت: مرسل حدیث ہمارے اور جمہور کے یہاں حجت ہے۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایام تشریق کے درمیانی دن میں ہمیں خطبۂ وداع دیا اور فرمایا: اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ خبردار! عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، اور نہ عجمی کو عربی پر، نہ سرخ کو کالے پر، اور نہ کالے کو سرخ پر، مگر تقوی سے، بے شک اللہ تعالیٰ کے یہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ سنتے ہو! کیا میں نے رب کا پیغام پہونچا دیا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا:

تقوی سے، اور آدمی کے برا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ بدگو، بے حیا اور کنجوس ہو۔

حدیث پاک میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے فرمان ’’طف الصاع‘‘ اضافت کے ساتھ، اس کا معنی ہے کہ تم میں سے بعض بعض کے قریب ہے۔ انتہی۔

قلت: اس حدیث کی تخریج امام طبرانی نے بھی ایک حدیث طویل میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے طریق سے کی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: تم لوگ تو ایک مرد وعورت سے ہو جُمام صاع کی طرح۔ کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقوی سے۔ انتہی۔

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا فرمان ’’جُمام الصاع‘‘ جیم کے ضمہ کے ساتھ، وہ چیز جو پیمانہ میں بھری جاتی ہے، اور معنی یہ ہے کہ تم قدر و منزلت میں ایک دوسرے کے برابر ہو پیمانہ میں بھرے ہوئے دانوں کی طرح، ناپنے سے ان کی مقدار معلوم ہو جاتی ہے اور ویسے دوسرے دانوں سے ناپ میں ان کی برابری بھی معلوم ہو جاتی ہے اور انہیں تولنے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے کہ وزن اور موٹائی میں وہ برابر ہوتے ہیں۔

اسی مضمون کو امام منذری نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ان سے ارشاد فرمایا: دیکھو! تم کالے اور سرخ سے بہتر نہیں، مگر یہ کہ تم اس پر تقوی کی وجہ سے فضیلت پاؤ۔

اس حدیث کو امام احمد بن حنبل نے روایت کیا، اور اس کے راوی ثقہ معروف ہیں مگر یہ کہ بکر بن عبداللہ مزنی کو حضرت ابوذر سے سماع حاصل نہیں۔ انتہی۔

قلت: مرسل حدیث ہمارے اور جمہور کے یہاں حجت ہے۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے بھی ہے، انھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایام تشریق کے درمیانی دن میں ہمیں خطبۂ وداع دیا اور فرمایا: اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے، اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے۔ خبردار! عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں، اور نہ عجمی کو عربی پر، نہ سرخ کو کالے پر، اور نہ کالے کو سرخ پر، مگر تقوی سے، بے شک اللہ تعالیٰ کے یہاں تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے۔ سنتے ہو! کیا میں نے رب کا پیغام پہونچا دیا؟ صحابہ کرام نے عرض کیا:

ہاں کیوں نہیں، یارسول اللہ ۔صلی اللہ تعالیٰ علیک وسلم۔ پھر فرمایا: اچھا تو جو حاضر ہیں وہ غائبین کو یہ پیغام پہونچادیں۔اس کے بعد: خون، مال، اور آبرو کی حرمت سے متعلق حدیث ذکر کی۔

امام منذری نے کہا: اس کی سند میں بعض راوی مجہول ہیں۔

قلت: شواہد میں راوی کی جہالت ہمیں مضر نہیں۔

امام طبرانی معجم کبیر میں حضرت حبیب بن خراش رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں، کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقوی سے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس معنی کی احادیث بکثرت ہیں، پھر یہ بھی پیش نظر رہے کہ کرامت وتقوی دونوں کلی مشکک کے قبیل سے ہیں، لہذا جب تقوی زیادہ ہوگا تو کرامت میں بھی اضافہ ہوگا، اور جب تقوی کم ہوگا کرامت میں بھی نقصان آئے گا۔اور جب تقوی میں دو شخص برابر ہوں گے تو کرامت میں بھی برابر ہوں گے، جیسے نافرمانی ذلت کا سبب ہے، تو ذلت نافرمانی کی زیادتی سے زیادہ ہوگی اور اس کی کمی سے کم ہوگی۔اسی طرح یہ سلسلہ دراز ہوگا۔

جب یہ بات ثابت ہو چکی تو ہمارے قول ''کل أكرم أتقى'' کی تحلیل تین قضیوں کی طرف ہوگی۔

(۱) یہی قضیہ کہ ''ہر اکرم اتقی ہے''

(۲) ہر وہ شخص جو عزت میں دوسرے سے ناقص ہوگا وہ اس سے تقوی میں بھی ناقص ہوگا۔

(۳) ہر دو شخص جو عزت میں برابر ہیں وہ تقوی میں برابر ہیں۔

اسی طرح دوسری آیت بھی تین مقدمات کی طرف منحل ہوگی۔

(۱) ابوبکر صدیق سب سے زیادہ صاحب تقوی ہیں۔یہ آیت میں صراحۃً مذکور ہے۔

(۲) تقویٰ میں ابوبکر صدیق سے زیادہ کوئی نہیں۔

(۳) تقویٰ میں ابوبکر صدیق کے برابر کوئی نہیں۔

اب تمہارے لیے اشکال کا دفع کرنا اور احتمال قطع کرنے کے لیے قیاس کی شکلوں کو مرتب کرنا آسان ہوگیا۔والحمد لله المهيمن المتعال۔

یہ تمام جوابات اور دفع اشکالات وہ ہیں جن کو مولیٰ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل عظیم اور کرم رفیع سے ہمیں الہام فرمایا، اور اپنے عظیم احسانوں اور حسین نعمتوں سے ہم پر بخشش فرمائی کہ اہل سنت و جماعت کی دلیل کو ہم نے مستحکم کیا اور بے کاری و بے حیائی والوں کے شبہات کو دفع کیا۔

اور میں امید کرتا ہوں کہ ان خیموں میں ایسی خوبصورت دلہنیں ہیں کہ اندھیروں کو کافور کر رہی ہیں اور ایسی صورتیں ہیں جن کی مسکراہٹ کے وقت ان کے دانت بارش کے اولوں کی طرح معلوم ہوتے ہیں ان میں اکثر کا میں ہی صاحب و مالک ہوں، اور ان کے حجرے میں مجھے داخل ہونے کی اجازت ہے۔(۱)

اس سے پہلے ایک شاعر نے کہا تھا:

لیس علی اللہ بمستنکر　　　أن یجمع العالم في واحد

اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے کوئی مستبعد نہیں کہ عالم کی خوبیاں ایک شخص میں جمع کر دے۔

تو اب میں کہہ رہا ہوں:

قد قدر اللہ فلاتنکر　　　اِن لَحِق العاجز بالقادر

بے شک اللہ تعالیٰ نے مقدر فرمادیا تو اس بات کا انکار نہ کر اگر عاجز قادر سے جاملا۔

کیف وقد فاز بأفضاله ال　کل فما ظنك بالقادري

کیوں نہ ہو اللہ تعالیٰ کے فضل سے سب بہرہ مند ہیں، تو (قادر کی طرف منسوب) قادری کے بارے میں تیرا کیا گمان ہے۔

---

(۱)　(ادائے مفہوم بلفظ دیگر) میں امید کرتا ہوں کہ گذشتہ عبارات میں جو ایسے روشن معانی ہیں جن کی چمک اور روشنی گمراہی کے اندھیروں کو کافور کر رہی ہے، اور ان میں ایسے پر نور مفاہیم ہیں جو شکوک وشبہات کی گھٹاؤں میں اجالے کا سامان فراہم کر رہے ہیں ان میں اکثر میری ہی کاوش کا نتیجہ ہیں اور میں نے ہی اپنی خداداد صلاحیت سے ان کو پردۂ خفا سے نکال کر صفحۂ قرطاس پر ثبت کیا ہے۔

خاتمہ

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں حسن خاتمہ نصیب فرمائے۔آمین بجاہ النبي الكريم عليه التحية والتسليم.

اب اگر تم کہو کہ اے کم رتبہ! بے شک اللہ تعالیٰ نے تیرے اوپر احسان فرمایا، اور تو نے وہ کلمات تحریر کیے جو سمندر کی گہرائی میں پہنچ گئے، اب مجھے بتا کہ اس مسئلہ میں تیرا کیا حکم ہے، کیا میں اس استدلال کی طرف نظر کرتے ہوئے صدیق اکبر کی افضلیت کو قطعی یقینی مان لوں، حالانکہ اس آیت میں تاویل واحتمال ہے، اس لیے کہ بعض نے اتقی کو تقی کے معنی میں لیا ہے، اگرچہ تو نے ان کی بات کو صاف ستھری تحقیق سے غلط ثابت کر دیا ہے۔

اس کے جواب میں کہوں گا کہ ہاں، تم قطعی مانو اور قیل وقال کی پرواہ نہ کرو، اس لیے کہ دو قطعی ہمیشہ قطعی نتیجہ دیتے ہیں۔اس سے پہلے تم سن چکے کہ اتقی سے مراد صدیق اکبر ہیں، اور اس پر امت کا اجماع ہے، اس کے خلاف کسی ایک کی کمزور سی رائے بھی منقول نہیں، تو یہ اجماع قطعی ہوا۔اس کے علاوہ دوسری آیت تو مدعا میں نص ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

رہا وہ جو تم نے کہا کہ بعض لوگ تاویل کی طرف گئے ہیں، تو اس کے بارے میں سن چکے کہ آیت میں تاویل کی گنجائش نہیں، اور اگر احتمال بے دلیل ہو تو یہ قرآن کریم کی آیت کو قطعی دلیل کے عظیم درجے سے نیچے نہیں لاسکتا۔کیا آپ نہیں جانتے کہ ہر نص (اصطلاحی) تاویل کا احتمال رکھتا ہے اس کے باوجود وہ یقیناً قطعی ہے، جیسا کہ ائمہ اصول اس کی تصریح فرما چکے۔

اس مقام کی تحقیق۔ اس طور پر کہ اللہ تعالیٰ ملک علام نے میرے دل میں القا فرمایا۔یہ ہے کہ علم قطعی دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اول: یہ ہے کہ احتمال بالکل ہی منقطع ہو جائے، اور اس کا نام ونشان نہ رہے، یہ اخص اعلی ہے جیسا کہ اس محکم اور مفسر میں ہوتا ہے جو متواتر ہیں، [اصول دین اور عقائد اسلام میں یہی علم قطعی مطلوب ہوتا ہے۔یہاں خبر مشہور بھی کافی نہیں]

دوم: یہ کہ اس جگہ ایسا احتمال نہ ہو جو کسی دلیل سے پیدا ہو، اگر چہ نفس احتمال باقی ہو، جیسے معنی مجازی مراد لینا یا کسی عام میں تخصیص کر دینا، اور ان کے علاوہ تاویل کی دوسری قسمیں جو ظاہر، نص اور احادیث مشہورہ میں ہوتی ہیں۔

پہلے معنی کا نام علم الیقین ہے، اس کا مخالف ومنکر کافر ہے، مگر اس میں ایک اختلاف ہے، فقہائے کرام علی الاطلاق اس کے منکر کو کافر کہتے ہیں۔ اور علمائے متکلمین اس میں ضروریات دین کی قید لگاتے ہیں۔(۱)

دوسرے معنی کا نام علم طمانیت ہے، اس کا مخالف ومنکر بدعتی اور گمراہ ہے، اس کو کافر کہنے کی گنجائش نہیں، جیسے قیامت کے دن اعمال کو تولنے کا مسئلہ، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ﴾ اور قیامت کے دن تولنا برحق ہے۔ اس آیت میں احتمال ہے کہ اعمال تولنے کا مطلب ''پرکھنا'' ہو یعنی اعمال کو پرکھا جائے گا، مگر یہ ایسا احتمال ہے جس کی طرف پھیرنے والی کوئی چیز نہیں اور نہ ہی اس پر کوئی دلیل ہے۔ جب پرکھنے کے معنی لیے جائیں گے تو یہ تمہارے اس قول کی طرح ہوگا کہ میں نے اس کو میزان عقل میں تولا، اور یہ معنی اہل عرب کی طرح عجم میں بھی رائج ہیں، تم کہتے ہو: ''سخن سنج'' یعنی کلام کو پرکھنے والا۔

اسی طرح مومنین کے لئے دیدار الٰہی کا مسئلہ ہے، (رزقنا المولیٰ بفضله العمیم) اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ﴿وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ، إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ﴾ کچھ منہ اس دن تروتازہ ہوں گے اپنے رب کو دیکھتے۔ اس آیت میں معنی امید ورجا کا احتمال ہے، [یعنی اپنے رب کو دیکھتے ہوں گے کا مطلب یہ کہ اس سے آس لگائے ہوں گے] اہل عرب وعجم کے محاورات اس طرح کے معنی پر بھی متفق ہیں، تم کہتے ہو'' آں دست نگر من است'' وہ میرے ہاتھ پر نظر رکھنے والا ہے۔ یعنی وہ میری عطا کا امیدوار اور میری بخشش کا محتاج ہے

(۱) اس کی ایک مثال یہ دی گئی کہ لڑکی کی موجودگی میں پوتی کو چھٹا حصہ ملے گا، یہ قرآن کے نص قطعی غیر محتمل تاویل سے ثابت ہے، مگر ضروری دینی کی حد کو نہ پہنچا، اگر کوئی اس کا منکر ہو تو فقہا انکار قطعی کی وجہ سے اس کی تکفیر کریں گے اور متکلمین اس کی تکفیر نہ کریں گے، اس لیے کہ یہ ایسے قطعی کا انکار ہے جو ضروری دینی کی حد کو نہ پہنچا۔ (مترجم)

اسی طرح تمام آسمانوں کی بلندی تک معراج کا مسئلہ، اور حضور سید عالم مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے لیے شفاعت کبریٰ کا مسئلہ۔

یہ تمام عقائد و مسائل ایسے نصوص سے ثابت ہیں جو قطعی بمعنی ثانی ہیں، اسی لیے تو ہم معتزلہ اور اہل تاویل قدیم روافض (۱) کی تکفیر نہیں کرتے۔

اسی طرح ظن کے بھی دو معنی ہیں: اس لیے کہ عام کا مقابل (ضد) خاص اور خاص کا مقابل عام ہوتا۔ کما لا یخفی (۲)

جب تم یہ جان چکے، تو ہمارے اس زیر بحث مسئلہ تفضیل میں اگر قطعی بالمعنی الاخص مراد لیا جائے تو یہ مشکل ترین راستہ ہے، اس لیے کہ اس مسئلہ کا ثبوت یا تو نص سے ہے یا ظاہر سے، اور یہ دونوں تاویل کو قبول کرتے ہیں، خواہ ضعیف و بعید تاویل ہو۔ یا۔ ابعد و اضعف (۳)، جیسے ہماری بحث میں ''اتقی'' کے سلسلہ میں احتمال ہے کہ مجازاً وہ شخص مراد ہو جو تقویٰ و پرہیز گاری میں بڑی حد کو پہنچا ہوا ہے اگر چہ وہ سب سے زیادہ متقی نہیں۔ اسی طرح احادیث میں لفظ ''افضل'' جو وارد ہوا اس میں احتمال ہے کہ یہاں ''من'' مقدر ہو، جیسے قائل کا قول: ''فلان أعقل الناس'' یعنی فلاں عام لوگوں سے زیادہ عقل مند ہے۔ اور وہ احادیث جو اس سلسلہ میں مفسر و محکم وارد ہوئیں وہ اخبار احاد ہیں، ان میں ہم تک منقول ہو کر آنے کے سلسلہ

---

(۱) یہ قید اس لیے ہے کہ موجودہ روافض اکثر مرتد ہیں، کیوں کہ ضروریات دین کے منکر ہیں۔ اسی پر میرا فتویٰ ہے اور یہی میرا مذہب ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔ منہ رحمہ اللہ تعالیٰ

(۲) ظنی اسے کہتے ہیں جس میں کوئی احتمال ہو۔ اگر احتمال کسی دلیل کی بنیاد پر ہے تو یہ ظنی بالاخص ہے۔ اور بلا دلیل ہے تو ظنی بالاعم۔ اسی کو اعلیٰ حضرت نے فرمایا کہ عام کا مقابل خاص اور خاص کا مقابل عام ہوتا ہے۔

مزید وضاحت یوں ہے: کہ قطعی اور ظنی کے درمیان اگر ہر ایک کی قسموں کا لحاظ رکھا جائے تو نسبت عموم خصوص من وجہ کی ہے۔ یعنی ظنی اسے کہتے ہیں جس میں احتمال ہو، اگر احتمال بالدلیل ہے تو یہ ظنی بالمعنی الاخص ہے، اور بلا دلیل ہے تو ظنی بالمعنی الاعم ہے۔ چناں چہ قطعی بالمعنی الاعم اور ظنی بالمعنی الاعم مادۂ اجتماع ہے۔ کہ احتمال ہے تو ظنی ہوا۔ اور بلا دلیل ہے تو قطعی رہا۔ رہے قطعی بالمعنی الاخص اور ظنی بالمعنی الاخص تو ان دونوں میں افتراق وجدائی ہے۔ کیوں کہ قطعی اخص میں سرے سے احتمال ہی نہیں۔ اور ظنی اخص میں احتمال بالدلیل ہے۔ (مترجم)

(۳) نشر بر خلاف لف ہے (لف ونشر غیر مرتب ہے) کیوں کہ ''ظاہر'' میں احتمال، بعید ہوتا ہے اور ''نص'' میں ابعد، جیسا کہ تلویح وغیرہ میں ہے۔ منہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ)

میں احتمال ہے۔ لیکن زیر بحث مسئلہ میں ہمیں قطعی بالمعنی الاخص سے کیا غرض، اس لیے کہ ہم فرقہ تفضیلیہ کو کافر تو نہیں کہتے، معاذ اللہ! کہ ہم انہیں کافر کہیں۔

لیکن بدعت و بدمذہبی کا ثبوت قطعی بمعنی ثانی کی مخالفت سے ہو جاتا ہے اور وہ بلاشبہ حاصل ہے، اس کے انکار کی گنجائش نہیں، ہاں جو غافل ہو یا زبردستی غافل بنے وہ انکار کر بیٹھے تو یہ اس کی اپنی کمی اور کوتاہی ہے۔ اس سلسلہ میں واضح اور کثرت سے نصوص آئے اور احادیث تواتر معنوی کی حد کو پہنچ گئیں۔ لہذا اگر رکیک احتمالات بلا دلیل رونما ہوں بھی تو قطعی بمعنی ثانی میں خلل انداز نہ ہوں گے، جیسا کہ علمائے اصول نے اس کی تصریح فرمائی۔ پھر ہمارے لیے نور علی نور اور ہدایت بالائے ہدایت یہ ہے کہ ہمارا موقف صحابہ کرام اور تابعین عظام کے اجماع سے مؤید ہے، جیسا کہ جمہور ائمہ اعلام نے اس کو نقل فرمایا۔ ناقلین میں سے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت ابو ہریرہ۔ تابعین میں میمون بن مہران۔ اور تبع تابعین میں امام شافعی اور ان کے علاوہ دیگر حضرات اس کثرت سے ہیں جن کا شمار نہیں۔ البتہ یہاں ابن عبدالبر نے بطور حکایت ذکر کیا ہے کہ حضرت ابوبکر و علی کی تفضیل میں سلف کا اختلاف تھا جو نہ درایۃً معقول اور نہ روایۃً مقبول، جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب ''مطلع القمرين في إبانة سبقة العمرين'' میں اس کو تحقیق سے بیان کیا۔ ساتھ ہی قرآن کریم اور احادیث مصطفیٰ علیہ التحیۃ والثنا نے دلائل کثیرہ کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی، جو ان دونوں یعنی قرآن وحدیث سے بطور استنباط ماخوذ ہیں، اور اس فقیر ناتواں کو اس کی توفیق ملی، چنانچہ میں نے اپنی عظیم کتاب یعنی ''منتهى التفصيل لمبحث التفضيل'' میں اس کے لیے باب ثانی وضع کیا۔ بالفرض ان دلائل کثیرہ میں سے فقط ایک ہی دلیل ہوتی تو وہی ہمارے موقف کے لیے شافی وکافی ہوتی، اور ہر شک وشبہ کی دافع اور نافی قرار پاتی۔ پھر اب کیا حال ہوگا جب کہ دلائل کثیر وجلیل ہیں کہ انہوں نے مسئلہ تفضیل کو مضبوط کیا۔ شکوک وشبہات کی گرہوں کو کھول دیا۔ فرقہ تفضیلیہ پر رعد و برق بن کر گرجے اور چمکے۔ اور اہل سنت کے قلوب کو منور ومجلی کرتے چلے گئے۔

تمہارے رب کی قسم! اب نہ شک کا کوئی محل رہا اور نہ شبہ کو کوئی دخل، والحمد لله الأعلى الأجل۔

ہاں اس شخص کا قول جس نے یوں کہا کہ ہم نے تو مسئلہ تفضیل میں نصوص کو متعارض پایا، تو یہ اس شخص نے اپنے حال کی خبر دی۔ پھر اس کا یہ قول ان پر کیسے حجت ہو جائے گا جنہوں نے نظر وفکر سے کام لیا، پھر جانچا اور پرکھا، پھر نصوص کے معانی کو اچھی طرح جانا اور ان کے مطالب کا علمی لحاظ سے احاطہ کیا۔ علاوہ ازیں اگر تعارض سے اس کی مراد تعارض صوری ہے کہ کبھی تعارض کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے جیسے علمائے اصول فرماتے ہیں کہ تعارض کے وقت محکم کو مفسر پر، مفسر کو نص پر، اور نص کو ظاہر پر مقدم کیا جائے گا، باوجودے کہ کسی ضعیف کا قوی کے ساتھ تعارض ہو ہی نہیں سکتا، تو اس تعارض صوری کا قول نہ ہمارے لیے مضر اور نہ اس کے لیے مفید۔ اور اگر تعارض حقیقی مراد ہے یعنی دو یکساں دلیلوں کا آپس میں متزاحم ہونا تو یہ قول محو کر دینے کے لائق ہے کہ یہ غفلت کی وجہ سے پیدا ہوا، اس کے قائل پر یا جو اس کے طریقہ پر چلے لازم ہے کہ اپنے دعوی کو روشن دلیل سے ثابت کرے۔ اور یہ ان سے کیوں کر ہو سکے گا۔

میں اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ اس کے خود ساختہ تعارض کا انجام اس وقت کیا ہوگا جب یہ ان احادیث کا مطالعہ کرے گا کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

(۱) ''لا تخیروا بین الأنبیاء'' انبیائے کرام میں کسی کو کسی پر فضیلت مت دو۔

(۲) ''ولا تفضلوني علی یونس بن متی'' اور مجھے یونس بن متی پر فضیلت مت دو۔

(۳) ''أفضل الأنبیاء آدم'' انبیائے کرام کے درمیان حضرت آدم سب سے زیادہ فضیلت والے ہیں۔

(۴) ''وذاك أي خیر البریة ابراهیم'' اور حضرت ابراہیم مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔

ان احادیث کے پیش نظر کیا وہ شخص یہ کہے گا کہ مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تمام جہان پر فضیلت کے سلسلہ میں روایات میں تعارض ہے؟ یا پھر اپنے نفس کا محاسبہ کرے گا اور سمجھ لے گا کہ تعارض ایک الگ چیز ہے، اور محض نفی واثبات کا وجود دوسری چیز۔

اس بے نظیر تحقیق انیق سے جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے ہمیں عنایت فرمائی، ہم ائمۂ کرام کے اقوال میں تطبیق بھی کر سکتے ہیں: اس طرح کہ جنھوں نے اس مسئلہ تفضیل کو قطعی کہا

اور ظنی ہونے کی نفی کی ان کی مراد قطعی بالمعنی الاعم ہے (جس سے علم طمانیت حاصل ہوتا ہے) اور ظنی بالمعنی الاخص ہے۔ (یعنی ظنی کی نفی سے یہ مراد ہے کہ اس کے مقابل کوئی ایسا احتمال نہیں جو کسی دلیل سے مؤید ہو) یہ بات قطعاً حق ہے جس میں کوئی شبہ نہیں۔

اور جنھوں نے اس کے برعکس کہا تو ان کی مراد بھی برعکس ہے (یعنی ظنی کہا اور مراد ظنی بالمعنی الاعم ہے، اور قطعی کی نفی کی تو مراد قطعی بالمعنی الاخص ہے، اور ظنیت کے اثبات کا یہ مطلب ہے کہ یہاں احتمال موجود ہے اگرچہ وہ کسی دلیل سے مؤید نہیں اور قطعیت کی نفی کا یہ مطلب ہے کہ ایسا قطعی نہیں جو ہر قسم کے احتمال کو اگرچہ احتمال بے دلیل ہی ہو، قطع کر دے) اور یہ بات قطعاً سچ ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں۔

اب یہاں کسی کے دل میں یہ کھٹک ہو سکتی ہے کہ مسئلہ تفضیل تو اعتقادیات سے ہے پھر تم نے قطعی بالمعنی الاعم پر کیسے اکتفا کر لیا؟۔

قلت: میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض تو ان حضرات پر زیادہ شدت سے وارد ہوگا جو ظنی کے قائل ہیں اور ظنی بالمعنی الاخص مراد لیتے ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مسئلہ اصول اسلام سے نہیں کہ اس کے منکر کو کافر کہا جائے، جیسے خلفائے راشدین کی خلافت کا مسئلہ۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

اس مثال سے تو ان اہل باطل میں سے ان کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا جو یہ کہتے ہیں کہ جب یہ مسئلہ اصول دین سے نہیں تو پھر اس کا ماننا ہم پر لازم بھی نہیں۔ ایسے لوگوں سے کہو کہ پھر تو تم خلفائے اربعہ کی خلافت کا بھی انکار کر بیٹھو کہ یہ بھی تو اصول دین سے نہیں۔ جیسا کہ میر سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں اور ان کے علاوہ دوسرے علمائے متکلمین نے اس مسئلہ کی صراحت کی۔ اسی طرح وہ شخص جس نے جہالت وحماقت کے مناصب میں سرداری کا عہدہ اپنے لیے اختیار کیا اور بولا: جب یہ مسئلہ قطعی نہیں تو اسے تسلیم نہ کرنے کی ہمارے لیے گنجائش ہے۔

ایسے تمام لوگوں کے لیے ایک ہی جواب ہے کہ تم سارے واجبات چھوڑ دو پھر دیکھو کہ تمہیں شریعت کی کیسی وعید سنائی جاتی ہے اور تمہارے گنہگار ہونے کی کیسی تہدید آتی ہے۔

جب تمہیں یہ معلوم ہو گیا کہ ہماری یہ تحقیق ایسی ہے جو خلاف کو دور کرتی اور علمائے کرام کے اقوال میں تطبیق پیدا کرتی ہے تو تم لازمی طور پر اس کو اختیار کر لو، خواہ اقوال متفق ہوں یا مختلف، اس لیے کہ ایک جامع بات ان باتوں سے بہتر ہے جن میں باہم ٹکراؤ ہے۔ اب اگر تمہیں متاخرین میں کسی کی کوئی عبارت اس روشن تحقیق کے خلاف ملے تو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رکھنا کہ ائمہ دین کی ایک جماعت کو خاطی ٹھہرانے سے بہتر ہے کہ اس شخص کی بات غلط مان لی جائے، ائمہ دین میں خاص طور پر وہ حضرات بھی ہیں جنھوں نے اس مسئلہ کو قطعی کہا اور یہ دین اسلام کے عظیم ستون اور شریعت مطہرہ کے ارکان کو مضبوط و مستحکم کرنے والے ہیں، ان حضرات میں سر فہرست ان سب میں اول و اولیٰ، سب کے سردار و مولیٰ، مسئلہ تفضیل کو سب سے زیادہ تفصیل سے بیان فرمانے والے، اور مخالفین کو سب سے زیادہ عبرت ناک سزا دینے والے، اللہ تعالیٰ کے شیر سیدنا علی مرتضی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم ہیں، اس لیے کہ ان سے یہ روایت متواتر ہے کہ آپ نے اپنی خلافت اور کرسی قیادت کے زمانے میں شیخین کریمین سیدنا ابو بکر صدیق و عمر فاروق کو اپنے اوپر اور تمام امت پر فضیلت دی، اور ان دونوں قوتوں کے ذریعہ لوگوں کے شانوں اور پشتوں کے درمیان ضرب لگائی یہاں تک کہ شکوک و شبہات کی اندھیریاں چھٹ گئیں۔

چنانچہ امام دار قطنی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جس کسی کو بھی میں ایسا پاؤں گا کہ وہ مجھے صدیق اکبر اور فاروق اعظم پر فضیلت دیتا ہے تو میں اس پر افترا کرنے والے کی حد جاری کروں گا۔

فن تنقید کے سلطان حضرت ابو عبد اللہ ذہبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔

قلت: اس وعید شدید کو دیکھو، کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مسئلہ تفضیل ظنی تھا اور صحابہ و تابعین کے خیالات باہم مختلف اور متعارض تھے پھر بھی معاذ اللہ حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حد جاری کرنے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جرأت کی؟ نہیں ایسا نہیں، بلکہ وہ تو خود حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے اس حدیث کے راوی ہیں کہ حدود کو دفع کرو اور ٹالو۔ امام دار قطنی اور امام بیہقی نے اس حدیث کو حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا۔

دوسری حدیث میں ہے: رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مسلمانوں سے حدود کو دفع کرو جہاں تک تم سے ہو سکے، پھر اگر تم مسلمان کے لیے نکلنے کی کوئی گنجائش دیکھو تو اس کی راہ چھوڑ دو، اس لیے کہ امام کا معافی میں خطا کر جانا اس سے بہتر ہے کہ وہ سزا دینے میں غلطی کر بیٹھے۔ اس حدیث کو ابن ابی شیبہ، امام ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا۔

حضرت مولی علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کا یہ طریقہ تھا کہ عام مجمعوں، بھری محفلوں اور جامع مسجدوں میں اس بات کا اعلان فرماتے، سامعین میں صحابہ وتابعین ہوتے، مگر ان میں سے کسی کے بارے میں منقول نہیں کہ انھوں نے سیدنا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قول کو رد کیا ہو، حالانکہ یہ حضرات اللہ تعالیٰ سے بہت ڈرنے والے تھے، اور اس بات سے بہت دور تھے کہ حق بات کا اظہار کرنے میں خاموش رہتے یا کسی خطا کو باقی رکھتے۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان کا یہ وصف بیان فرمایا کہ: وہ بہترین امت ہیں جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی کہ بھلائی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں، اور ان حضرات کے ائمہ کرام (خلفائے راشدین) ان سے زیادہ متقی اور ہدایت وصواب کے ان سے زیادہ خواہش مند تھے، وہ حضرات تو اہل علم کو اس پر برانگیختہ کرتے کہ ہم سے کوئی خطا ہو تو حق کو واضح کریں اور ہم میں کوئی کجی ہو تو اسے ٹھیک کریں، علمائے کرام کو اگر ان سے کوئی لغزش ہوتی تو حق کے اظہار پر ابھارتے، اور اگر حق سے انحراف کرتے تو ان کی کجی کو دور کرتے۔ اور یہ حضرت عمر فاروق اعظم ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی تعمیل میں نہایت سخت تھے۔(۱)

---

(۱) محمد بن مسلمہ وہ جلیل القدر صحابی تھے جنھیں حضرت عمر گورنروں سے متعلق شکایات کی تفتیش اور بر سر عام ان کی جانچ کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ ایک بار ان سے فاروق اعظم نے پوچھ لیا: تم مجھے کیسا پاتے ہو؟ انھوں نے کہا: خدا کی قسم آپ کو ویسا ہی پاتا ہوں جیسا میں چاہتا ہوں اور جیسا ہر وہ شخص چاہتا ہے جو آپ کی بھلائی چاہتا ہے۔ میں آپ کو مال جمع کرنے پر قادر، خود مال سے کنارہ کش اور مال کی تقسیم میں عادل پاتا ہوں۔ اور اگر راہ عدل سے آپ نے کجی اختیار کی تو ہم آپ کو سیدھا کر دیں گے جیسے تیر کو آلہ سے سیدھا کیا جاتا ہے۔ حضرت فاروق نے فرمایا: خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسی قوم میں رکھا ہے کہ اگر میں کج ہو جاؤں تو وہ مجھے سیدھا کر دے۔
(کنز العمال، ۱۴/ ۲۱۰۔ بحوالہ سال نامہ اہل سنت کی آواز (اسلام میں نظام اخلاق نمبر، ص: ۲۰۸) مضمون حضرت علامہ محمد احمد مصباحی)

انہی حضرات میں سے جنھوں نے تفضیل شیخین پر اجماع کی خبر دی حضرت میمون بن مہران ہیں جو فقہائے تابعین میں شمار ہوتے ہیں، ان سے حضرت ابوبکر صدیق اور فاروق اعظم کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ افضل ہیں یا حضرت علی؟ یہ جملہ سن کر ان کے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو گئے اور ان کی رگیں پھڑکنے لگیں یہاں تک کہ آپ کے ہاتھ سے عصا بھی گر گیا اور فرمایا: میں نہیں سمجھتا تھا کہ میں اس زمانہ تک زندہ رہوں گا جس میں لوگ ابوبکر وعمر پر کسی کو فضیلت دیں گے، او کما قال، ابونعیم نے اسے حضرت فرات بن سائب سے روایت کیا۔

انہی حضرات میں عالم مدینہ امام مالک بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد لوگوں میں افضل کون ہے؟ فرمایا: ابوبکر وعمر، پھر فرمایا: کیا اس میں شک ہے؟۔

انہی حضرات میں امام اعظم اقدم واعلم واکرم سیدنا ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ہیں، آپ سے اہل سنت وجماعت کی علامت ونشانی کے بارے میں سوال ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا: شیخین ابوبکر وعمر کو فضیلت دینا، ختنین عثمان وعلی سے محبت رکھنا، اور موزوں پر مسح کرنا۔

انہی میں عالم قریش روئے زمین کو علم سے بھر دینے والے سیدنا امام محمد بن ادریس شافعی مطلبی ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ آپ نے تفضیل شیخین پر صحابہ کرام اور تابعین عظام کا اجماع نقل فرمایا اور کسی اختلاف کی حکایت نہ کی۔

انہی میں امام اہل سنت وجماعت، صاحب حکمت یمانیہ سیدنا امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ بھی ہیں، جیسا کہ ثقہ علمائے کرام نے ان سے اجماع نقل فرمایا۔

انہی میں امام ہمام حجۃ الاسلام غزالی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں جنھوں نے ''احیاء العلوم'' کے باب ''قواعد العقائد'' بزرگوں کے عقائد بیان کیے ان میں مسئلہ تفضیل ذکر فرمایا: [کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بعد انسانوں میں سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان، پھر حضرت علی، رضی اللہ تعالیٰ عنہم] ذکر عقائد کے بعد آخر میں فرمایا: ''یہ سب عقائد وہ ہیں جن سے متعلق احادیث وارد ہیں اور جن پر آثار شاہد ہیں۔ تو جو شخص یقین کے ساتھ ان سب کا اعتقاد رکھے وہ اہل حق اور جماعت سنت سے ہوگا اور گمراہی کی

جماعت اور بد مذہبی و بدعت کے گروہ سے جدا ہوگا''۔

اورانہی میں ہیں جبل الحفظ علامۃ الوریٰ سیدنا ابن حجر عسقلانی، امام علام احمد بن محمد قسطلانی، مولانا الفاضل عبدالباقی زرقانی، ناظم قصیدہ بدء الامالی فاضل جلیل مولانا علی قاری وغیرہم۔ رحمۃ اللّٰہ تعالیٰ علیہم أجمعین ۔

ہم سے روایت بیان کی مولیٰ ثقہ ثبت سلالۃ العارفین سید شریف فاطمی سیدنا ابوالحسین احمد نوری نے، انہوں نے فرمایا کہ میں نے اپنے شیخ ومرشد سیدنا ومولانا آل رسول احمدی کو فرماتے سنا، انہوں نے فرمایا کہ میں نے شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کو تفضیل شیخین کے بارے میں فرماتے ہوئے سنا کہ یہ قطعی ہے۔ یا۔ قطعی کی طرح۔

أقــول : یہاں حضرت شاہ صاحب کے قول میں لفظ'' أوْ'' حرف تردید تردد اور شک کے لئے نہ مان کر دو قسمیں بیان کرنے کے لئے مان لیا جائے تو بھی بات درست ہوگی، وہ اس طرح کہ قطعی تو معنی ثانی کے اعتبار سے ہے، اور قطعی کی طرح معنی اول کے اعتبار سے۔

یہاں سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جس نے یہ کہا کہ ہم نے اجماع کرنے والوں کو بھی دیکھا کہ وہ ظن پر ہیں قطعیت ان کو حاصل نہیں، تو اس کی بات بھی سچ ہے اگر ظن بمعنی اعم اور قطع بمعنی اخص مراد لے، اس صورت میں یہ چیز نہ ہمارے لیے مضر اور نہ اس کو مفید۔ اور اگر اس کے برعکس مراد لے تو غلط، اور اس پر ان دلائل سے حجت قائم ہے جن کا سامنا کرنے کی اس میں طاقت نہیں۔ واللّٰہ تعالیٰ اعلم

اس موضوع پر یہ مختصر گفتگو تھی، اس میں ہم نے ان نکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے اندھیرے کافور ہو جاتے ہیں۔ اس موضوع کی تفصیل ہم نے اپنی کتاب ''منتھی التفصیل لمبحث التفضیل ''میں ملک جلیل کی توفیق سے کی ہے۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللّٰہ العلي العظیم۔

نکتہ:

امام رازی اپنی تفسیر '' مفاتیح الغیب '' میں فرماتے ہیں: سورۂ ''واللیل ''حضرت ابوبکر صدیق کی سورت ہے۔ اور سورۂ ''والضحی ''حضور اقدس محمد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ

وسلم کی سورت ہے۔ان دونوں سورتوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تا کہ خوب اچھی طرح جان لیا جائے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان بھی واسطہ نہیں، لہذا جب تم پہلے "والـلـیـل" کا ذکر کرو گے جس سے مراد ابو بکر صدیق ہیں، پھر اور آگے بلندی پر جاؤ گے تو "والضحی" دن کو پاؤ گے کہ اس سے مراد حضور اقدس محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، اور اگر پہلے "والـضـحی" کا ذکر کرو گے کہ اس سے مراد حضور احمد مجتبی محمد مصطفیٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں، پھر جب نیچے آؤ گے تو اس کے فوراً بعد "والـلـیـل" کو پاؤ گے، اور اس سے مراد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں تا کہ ان دونوں ترتیبوں سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ ان دونوں حضرات کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔

أقـول: اور "والـلـیـل" کو اس ترتیب کے اعتبار سے اس لیے مقدم کیا کہ یہ سورت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات اقدس پر کفار کی جانب سے ہونے والے طعن و تشنیع کے جواب میں ہے، اور "والـضـحـی" حضور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر طعن کے جواب میں، اور یہ خوب واضح ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی براءت و صفائی صدیق اکبر کی براءت کو مستلزم نہیں، اس لئے کہ حضور اعلیٰ ہیں، اور اعلیٰ کی براءت ادنیٰ کی براءت کو لازم نہیں کرتی، البتہ صدیق اکبر کی صفائی حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی براءت و صفائی کو بدرجہ اولیٰ مستلزم، اس لیے کہ صدیق اکبر اس لیے بری ہوئے کہ وہ تو اس بری اور ستھرے نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے غلام ہیں۔لہذا "واللیل" کو مقدم کرنے میں حکمت یہ ہے کہ دونوں طعن کا ایک ساتھ نہایت جلد جواب ہو، اگر اس سورت کو مؤخر کر دیا جاتا تو صدیق اکبر کے طعن کا جواب بھی مؤخر ہو جاتا۔

اقول: صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے متعلق سورت کا نام "والـلـیـل" اور حضور مصطفیٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تعلق سے نازل ہونے والی سورت کا نام "والـضـحی" اس لئے رکھا گیا تا کہ اس بات کی جانب اشارہ ہو جائے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صدیق اکبر کا نور، ان کی ہدایت، اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کا وسیلہ ہیں، نیز حضور کے وسیلہ سے ہی اللہ تعالیٰ کا فضل اور اس کی رضا طلب کی جاتی ہے۔اور صدیق اکبر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی راحت، انس، سکون اور اطمینان نفس کا ذریعہ ہیں، ان کے محرم راز اور خاص معاملات کے لباس و مصاحب، اللہ رب العزت جل جلالہ کا ارشاد ہے:

﴿وَجَعَلْنَا اللَّيْلَ لِبَاساً﴾ اور ہم نے رات کو پردہ پوش کیا۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَجَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴾ تمہارے لئے رات اور دن بنائے کہ رات میں آرام کرو، اور دن میں اس کا فضل ڈھونڈو، اور اس لیے کہ تم حق مانو۔

دوسرے اس بات کی جانب بھی اشارہ مقصود ہے کہ دین کا نظام ان دونوں ہستیوں سے قائم ہے جس طرح دنیوی نظام رات اور دن کے ذریعہ قائم ہے، اگر دن نہ ہوتا تو کچھ نظر نہ آتا، اور رات نہ ہوتی تو سکون وقرار حاصل نہ ہوتا۔ فالحمد لله العزيز الغفار۔

نکتہ:

قاضی امام ابوبکر باقلانی نے آیات کریمہ سے صدیق اکبر کی مولیٰ علی پر فضیلت ایک دوسرے طریقہ پر استنباط فرمائی۔ رضی الله تعالیٰ عنهما ولقاهما الله تعالیٰ بأحسن الرضا۔

ہمیں خبر دی سراج نے روایت کرتے ہوئے جمال سے، انھوں نے سندی سے، انھوں نے فلانی سے، انھوں نے محمد سعید سے، انھوں نے محمد طاہر سے، انھوں نے اپنے والد ابراہیم کردی سے، انھوں نے قشاشی سے، انھوں نے رملی سے، انھوں نے زین زکریا سے، انھوں نے ابن حجر سے، انھوں نے مجد الدین فیروز آبادی سے، انھوں نے حافظ سراج الدین قزوینی سے، انھوں نے قاضی ابوبکر تفتازانی سے، انھوں نے شرف الدین محمد بن محمد ہروی سے، انھوں نے محمد بن عمر رازی سے، انھوں نے اپنی تفسیر ''مفاتیح الغیب'' میں فرمایا کہ قاضی ابوبکر باقلانی نے ''کتاب الامامۃ'' میں یوں ذکر فرمایا: امیر المومنین مولی المسلمین حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ میں یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَاءً وَّلَا شُكُوْراً، إِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْماً عَبُوْساً قَمْطَرِيْراً﴾

ان سے کہتے ہیں: ہم تمہیں خاص اللہ تعالیٰ کے لئے کھانا دیتے ہیں، تم سے کوئی بدلہ یا شکرگزاری نہیں مانگتے، بے شک ہمیں اپنے رب سے ایک ایسے دن کا ڈر ہے جو بہت ترش نہایت سخت ہے۔

اور وہ آیت جو امیر المومنین امام الصدیقین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حق میں اتری یہ ہے۔

﴿وَمَا لِأَحَدٍ عِنْدَهُ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰىٓ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلٰى ، وَلَسَوْفَ يَرْضٰى﴾

اور کسی کا اس پر کچھ احسان نہیں جس کا بدلہ دیا جائے، صرف اپنے رب کی رضا چاہتا جو سب سے بلند، اور بے شک قریب ہے کہ وہ راضی ہوگا۔

ان دونوں حضرات سے متعلق آیتیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دونوں نے نیکیاں اللہ تعالیٰ کی رضا وخوش نودی کے لیے کیں، مگر سیدنا حضرت علی سے متعلق آیت میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ اللہ تعالیٰ کی خوش نودی کے ساتھ روز قیامت کے ڈر سے بھی کیا۔ اسی لیے تو جن کو کھانا کھلایا ان سے فرمایا: بے شک ہمیں اپنے رب سے ایک ایسے دن کا ڈر ہے جو ترش نہایت سخت ہے۔ اور صدیق اکبر کے بارے میں نازل شدہ آیت اس بات کی طرف رہنمائی کررہی ہے کہ انہوں نے جو بھی کیا محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوش نودی کے لیے کیا۔ ان کی نیت میں کوئی طمع نہیں تھی جس سے کسی ثواب کی طرف رغبت یا سزا کا خوف دامن گیر ہوتا، لہذا صدیق اکبر کا مقام اعلی واجل ہوا۔

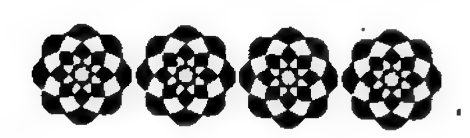
أقــول: تحقیق یہ ہے کہ تمام جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین مراتب ولایت: خلق سے فنا، اور حق کے ساتھ بقا میں اپنے علاوہ تمام اولیائے عظام سے افضل ہیں خواہ وہ کسی طبقہ کے ہوں، اور ان کی شان اس چیز سے بہت بلند ہے کہ وہ اپنے اعمال سے غیر اللہ کا قصد کریں، لیکن واضح رہے کہ درجات مختلف ہیں، مراتب میں ترتیب ہوتی ہے، ایک چیز

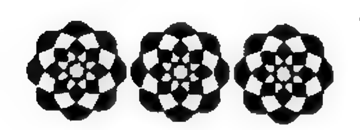
دوسری سے کم تر اور ایک فضیلت دوسری پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقام و مرتبہ اتنا عظیم ہے کہ وہاں نہایتیں ختم اور حدیں منقطع ہیں۔ اس لیے کہ امام القوم سیدی محی الملۃ والدین ابن عربی قدس اللہ تعالیٰ سرہ نے ''فتوحات مکیہ'' میں فرمایا: آپ اماموں کے امام اور سرداروں کے آقا ہیں، آپ کا مقام صدیقیت سے اعلیٰ اور شرعی احکام کے حامل منصب نبوت سے ادنی ہے۔ ان کے درمیان اور ان کے عظیم وجلیل مولیٰ کے درمیان محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سوا کوئی نہیں۔

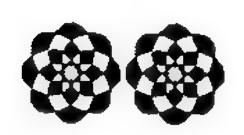
ہم نے خاتم المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام پر اپنی اس کتاب کو ختم کیا۔ اور تمام خوبیاں اللہ رب العزت کے لیے جو تمام عظمتوں کا مالک، کتاب رسول ہاشمی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تعریف وتوصیف پر ختم ہوئی، اللہ جل جلالہ خاتم رسالت کے نام پر ہمارا خاتمہ فرمائے۔

﴿سُبۡحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ وَسَلٰمٌ عَلَى الۡمُرۡسَلِيۡنَ وَالۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ﴾

پاکی ہے تمہارے رب کو عزت والے رب کو ان کی باتوں سے اور سلام ہے پیغمبروں پر اور سب خوبیاں اللہ کو جو سارے جہان کا رب ہے۔







رسالہ فتح خیبر

حضرت مولانا محمد شاہ قادری فیاضی بریلوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لمن یوکل الأمر إلیه ویتوکل العبد علیه والصلاة والسلام علی من الفضل بیدیه وآله وصحبه المرضیین لدیه آمین

امابعد

فقیر اوّاہ سراپا گناہ، بندہ محمد شاہ قادری فیاضی بریلوی عفا عنہ اللّٰہ تعالیٰ خدمت ارباب خبرت واصحاب فطنت میں عرض رسا کہ اس زمانۂ پرآشوب وفساد میں جہاں اور ہزار طرح کی بدمذہبیاں برہم زن خانۂ دین وایمان ہیں۔أعاذ نا اللّٰہ تعالیٰ من شرھن جمیعا وہاں اکثر عوام کے قلوب میں تشیع کی رگ خفی نے جنبش کی ہے کہ مسئلہ تفضیل حضرات عالیہ شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں عقیدۂ مجیدہ اہل سنت وجماعت نصرھم اللہ تعالیٰ سے جس پرآیات صریحہ واحادیث صحیحہ وخود ارشادات طیبات حضرت جناب مولیٰ علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ ناطق، اور زبان برکت نشان حضرات صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے آج تک اجماع اہل حق ثابت محقق در پردہ تاویل وتحویل وتصریف عدول محض کی ٹھہری ہے۔فضل شیخین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کوسیاست وخلافت وملک داری وملک گیری وغیرہا امور ظاہر یہ پر مقصور۔اور قرب الٰہ وکرامت عنداللہ میں حضرت جناب مرحب کش خیبر کشا کرم اللہ تعالیٰ وجہہ کی زیادت ومزیت مقبول ومنصور ٹھہراتے ہیں،اور غضب یہ کہ اپنے اس معنی تراشیدہ کو محمل نصوص افضلیت ومحصل عقیدۂ اہل سنت بتاتے ہیں۔کاش اس عقیدہ جدیدہ کو اپنی ہی طرف نسبت کرتے اور جمہور ائمہ اہل سنت کے سر نہ دھرتے۔مگر بحمد اللہ سنیت وہ میٹھا میٹھا پیارا پیارا نام ہے جسے یک لخت چھوڑ دینا بھی ذرا مشکل کام ہے۔

﴿وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ عَلٰى مَآ أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ

الطَّيِّبِ﴾(۱)

حق سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت کہ اس نے حضرات کی اس خلط ملط کو بچانہ رکھا اور علمائے دین کی سعی مشکور سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دکھایا۔ حضور پرنور غوث الاسلام والمسلمین حجۃ اللہ فی الارضین طراز دامن شریعت بہار گلشن حقیقت جامع فضائل معنوی وصوری حضرت سیدنا ومولانا سید ابوالحسین احمد نوری میاں صاحب قادری برکاتی احمدی آل رسولی مارہروی تاجدار سرکار مارہرہ منورہ أدام اللہ تعالیٰ ظلال جلالھم علینا نے رسالہ "دلیل المتقین من کلمات العارفین" میں اقوال اولیائے سلف واصفیائے خلف جمع فرما کر مذہب حق پر عرش تحقیق مستقر فرمایا۔ اور عامی جاہلوں کا وہ خیال ضلال کہ معاذ اللہ ائمہ طریقت برخلاف اہل سنت قرب الہ وکرامت جاہ میں تفضیل حضرات شیخین نہیں مانتے یکسر مٹایا اور حضرت استاذنا وملاذنا عالم دقیق النظر فاضل سنیت پرور نونہال دودمان فضائل فاضل ابن فاضل ابن فاضل حضرت مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب قادری برکاتی احمدی رسولی بریلوی دام بالعزو المجدد و الرشد وصین من شر حاسد اذا حسد نے خاص اپنی تحقیقات رائقہ وتدقیقات فائقہ سے ایک سفر عظیم وکتاب ضخیم تصنیف فرمائی جس کی لطافت مبانی ومتانت معانی وناز کی تدقیق وتازگی تحقیق دیکھ کر مخالف منصف بھی انشاء اللہ تعالیٰ بے ساختہ پکار اٹھے کہ: لا عطر بعد عروس.

ع: کم ترك الأول للآخر

ع: ذوق ایں مے نہ شناسی تا نہ چشی

﴿ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یشاء واللّٰہ ذو الفضل العظیم﴾(۲)

جب ان کتب کا تصنیف ہونا مشتہر ہوا، تعصب سے خدا بچائے، سمجھے کہ روش علمی میں تو مجال مقاومت نہیں، افترا و بہتان پر اتر آئے، طرح طرح کے اقوال فاسدہ وعقائد کاسدہ جس کے سننے سے ہر سنی مسلمان کو حیرت ہو، حیرت کیسی سخت نفرت ہو، اس فرقہ ناجیہ کی طرف نسبت

---

(۱) [سورۂ آل عمران: ۱۷۹]۔ اللہ مسلمانوں کو اس حال پر چھوڑنے کا نہیں جس پر تم ہو جب تک جدا نہ کردے گندے کو ستھرے سے۔

(۲) [سورۂ جمعہ: ۴]۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے دے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

کیے، کہ کسی طرح قلوب عوام ان کی طرف سے پھر جائیں اور ان کی بات سننے سمجھنے سے باز آئیں۔ ﴿کذلک کذب الذین من قبلھم﴾ (۱) ﴿واللہ المستعان علی ما تصفون﴾ (۲) بحمد اللہ ہمیشہ ان اکاذیب کی منتہائی سند ان حضرات کی زبان ہی رہی، کبھی کوئی دلیل قائم کرنا نصیب نہ ہوئی، بعض جلد باز جنھیں حضرت سے عقیدت خاص ونسبت اختصاص نہیں اگر چہ مجرد بیان پر ایمان لائے مگر جس حق طلب نے ادھر کے علما سے تحقیق کیا۔ یا ان کی تحریرات کو دیکھا وہ ان افتراؤں پر لاحول ہی پڑھ کر اٹھے ﴿وَ یُحِقُّ اللّٰہُ الْحَقَّ بِکَلِمٰتِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُجْرِمُوْنَ﴾ (۳) ادھر حضرت استاذ نا مولانا رضا مدظلہ نے حسب استدعاے اکابر وعمائد فرقہ تفضیلیہ کی ایک خبر پر اپنا خلاصۂ عقائد دستخط خاص سے تحریر فرما کر مہر لگا کر ان کے پاس بھیج دیا جس کے بعد چند روز تک عجب شور وغوغا رہا کہ علما جمع ہوں گے، اور اس تحریر کا جواب لکھا جائے گا۔ ہم مشتاقوں کے بھی دل میں جوش تھا کہ خدا کرے کسی طرح ہمت کر جائیں، شورش ساختہ کی چڑھی ہوئی ندیاں بے ساختہ اتر جائیں، مگر توبہ الٰہی چار برس گزرے ادھر سے صدائے برنخاست۔

ع: کچھ ایسا سوئے ہیں سونے والے کہ حشر تک جاگنا قسم ہے۔

اب واقعہ تازہ کا حال سنیے:

مرغ ہمت حضرات از آشیان عزیمت پریدن، وبہ پرواز اولین طعمہ شاہین آہنیں چنگال گردیدن، اب کوئی پانچ مہینے ہوئے کہ سالہا سال کے مشوروں میں یہی ٹھہری کہ فتح وشکست تو خدا کے ہاتھ ہے، عار مغلوبی نہیں اٹھائی جاتی، لاؤ جہان جہان اپنے موافقین ہیں سب کو جمع کر کے ایک بار ﴿فَیَمِیْلُوْنَ عَلَیْکُمْ مَّیْلَۃً وَّاحِدَۃً﴾ (۴) کا رنگ تو جما دیں، پھر جیسے گزرے گی، دیکھی جائے گی اور ادھر یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ حضرت مولانا مدظلہ العالی محض تنہا ہیں اور

(۱) [سورۂ انعام:۱۴۸] ایسا ہی ان سے اگلوں نے جھٹلایا تھا۔
(۲) [سورۂ یوسف:۱۸] اور اللہ ہی سے مدد چاہتا ہوں ان باتوں پر جو تم بتا رہے ہو۔
(۳) [سورۂ یونس:۸۲] اور اللہ اپنی باتوں سے حق کو حق کر دکھاتا ہے پڑے برا مانیں مجرم۔
(۴) [سورۂ نساء:۱۰۲] تو ایک دفعہ تم پر جھک پڑیں۔

اس پر مرض چشم و درد سینہ، علاوہ منضجیں ہو رہی ہیں، مسہل کا ارادہ ہے، اوپر سے بڑی پیش بندی یہ سوچ رکھی تھی کہ جیسے بن پڑے زبانی تقریر کی ٹھہرائیے، جب ہماری دس پندرہ آوازیں مختلف بولیاں چار جانب سے ہجوم کریں گی پھر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے، اگر پریشان ہو کر چپ ہی رہے تو بھی ہمارا غلبہ ہے، یہ بھی نہ سہی تو گفتگو میں کہنا، مکرنا، بکھرنا، بپھرنا، گرم ہونا، نرم کرنا، ہزار پہلو ہیں۔ اور شاید یوں بھی نہ چلی اور مخالف کہ بحمد اللہ سخت زبردست ہے غالب ہی آیا تو زبانی معاملہ کس نے دیکھا، کس نے جانا۔ اڑا دیں گے کہ ہمیں نے غلبہ پایا۔ اب کوئی تحریر تو ہے ہی نہیں جسے وہ پیش کر کے ہمیں جھوٹا کر دکھائیں گے، انتہا یہ ہے کہ وہ اپنا غلبہ بیان کریں گے، ہماری زبان کس نے روکی ہے، یوں ہی خبط ہو کر رہ جائے گا۔ ان ذریعوں سے پیش خود ہر طرح اپنی جیت سمجھ کر حضرت مولانا مدظلہ العالی کو پیام مناظرہ دیا اور موافقین کو خطوط روانہ ہوئے، اللہ کی عنایت سے مشاہیر علما تو ہندوستان سے لے کر حرمین شریفین ومصر وروم وشام ویمن ومغرب تک سب ہماری ہی طرف ہیں، حضرات کو علما ملتے کہاں سے، مگر خیر وہ جو کچھ بہم پہنچے شروع جمادی الآخرہ تک جمع ہوئے، جن کے سرکردہ وسرگردہ گویا شفیقنا مولوی محمد حسن صاحب سنبھلی تھے۔ حضرت مولانا مدظلہ العالی نے باوجود تنہائی وعلالت بحکم:

﴿اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ﴾(۱)

تصفیہ حق بہ نہایت رغبت قبول فرمایا، اور اول ہی بار ارشاد فرمایا: کہ ہم ہر طرح تحریر ہی پسند کرتے ہیں۔ حضرات نے اول رقعہ جو بھیجا پہلی بسم اللہ افترا سے شروع کی کہ آپ نے تو مناظرہ زبانی کو کہا تھا، جب ادھر سے گفتگو سابق یاد دلائی گئی اور جمع خرچ زبانی کے مفاسد بدلائل قرآن وحدیث ثابت کیے گئے تو بدقت تمام نہایت مجبوری سے تحریر ماننا پڑی، اور وہ خیالات جو اول دل میں جما چکے تھے جن کے بھروسے پر خواہی نخواہی اپنی ہی فتح سمجھ رکھی تھی،

---

(۱) [سورۂ آل عمران: ۱۷۳] وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ: لوگوں نے تمہارے لیے جتھا جوڑا تو ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور زائد ہوا اور بولے: اللہ ہم کو بس ہے اور کیا اچھا کارساز۔

بحمد اللہ ایک ہی وار میں کیا جانے کہاں سے کہاں گئے ۔ پھر تو لیلائی غیرت کے گیسو گندھے، شدت پیچ وتاب کے لام بندھے، غیظ وغضب کے نشان بڑھ چلے، طیش وخفت کے پھریرے کھلے، نفیر حمایت نے طبل جنگ بجایا، طنطنہ حسیت نے کڑکا سنایا، لشکر پسینہ جھوم جھوم کر بڑھا، غبار کینہ آسمان تک چڑھا۔

زگرد تعصب دران پہن دشت   زمین شش شد و آسمان بست گشت

اے بار الٰہ تیری پناہ! اب تو خدا دے اور بندہ لے، ہمیں تو تقریر ہی پر چنین وچناں ظن وگمان ہوا تھا، یہاں تحریر میں کون سا دقیقہ غایت رزانت ونہایت متانت کا اٹھا رکھا۔ خود فرمانا، خود پلٹ جانا، آپ ہی قول، آپ ہی عدول، بگڑنا، سنبھلنا، بکھرنا، مچلنا، پینترے بدلنا، پیچ کر نکلنا، پیمان شکنی، وفا دشمنی، بلکہ تصریحاً لکھ دینا کہ اب ہمیں وعدے پر قیام نہیں، عہد کا نبھانا ہمارا کام نہیں، ایک بات کا مدلل رد سمجھ لینا، بلا جواب پھر اسی کو پیش کر دینا، شانہ ہلا ہلا کر بات کیجیے، جواب کے نام پر فاتحہ پڑھ لیجیے، افزا آثار افزا انجام، اپنے گناہ کا دوسرے پر الزام، کبھی انجان بن کر یہ بھولی باتیں کہ ہم تو جانیں تحریر میں کسی کا نام نہ لکھیں، الزام مالا یلزم کی کثرت، کبھی حریف پر یہ جبروتی حکومت، کہ ہماری خواہش کے مطابق وار کرو، حملہ میں دوسرا طریقہ نہ اختیار کرو، یعنی ہم چھری سے لڑنا چاہیں تو تلوار نہ لیجیے، پالٹ پر آئیں تو چاکی کیجیے، یہاں تک کہ شدہ شدہ تہذیب بالائے طاق، ادب اجل مشتاق، غیظ وغضب کا جوش، طیش وخفت کا خروش، کبھی مناظرہ میں یاروں کے جلسے کا رنگ، کبھی بازاری گفتگو کا ڈھنگ، کبھی ایک بات پر اظہار پشیمانی، دم کے دم میں پھر وہی لن ترانی، آج ارسال مبادی کی درخواست کی، لیجیے صبح ہوتے بحث ہی بدل دی، ابھی مشرق میں سیر کر رہے تھے، ابھی دیکھو تو مغرب پر جا دھمکے، کچھ ذرا خفت ہوئی تو کہتے۔ ہم بحث ہی معین نہیں کرتے، جب پھر گھبراہٹ اٹھی تو وہی اگلا دم بھرتے۔

ازیں ہا دو صد حیلہ انگیختند ☆ بہر حملہ خون حق ریختند

جب حضرت فارس مضمار، تحقیق غارس اشجار، تدقیق بندہ بارگاہ رسالت پناہی، دشمن مخالفان شیر الٰہی۔

وہ عون ید اللہ کا ناز پرور   وہ آجام صولت کا ضرغام غالب

وہ جس کی سنان دشمنوں کی زرہ سے
گہے قصۂ باز و نسج العناکب

اعنی حضرت استاذنا و ملاذنا مدظلہ ودام فضلہ نے یہ رنگ ملاحظہ فرمایا کہ مخالف کچھ سمجھ کر میدان بدلتے اور مسئلہ تفضیل میں نزاع سے نکلتے ہیں، دو سادات کرام جلیل القدر معظم فریقین سے جو ابتدا سے واسطہ گفتگو و رسائل بلکہ اس عقیدہ میں خود حضرت کی طرف مائل تھے، ایک شہادت نامہ اس مضمون کا لکھوا کر کہ واقعی آج تک مابہ النزاع مسئلہ تفضیل تھا، اور اسی کا تصفیہ مبنائے مناظرہ تھا، اور اس کے سوا کسی مسئلہ کا ذکر نہ کیا تھا، حضرات کی خدمت میں روانہ کیا، اور اس کے ساتھ بمقتضائے عالی ہم نے وعدہ مشرعانہ لکھ بھیجا، کہ حضرت جس مسئلہ میں نزاع ہو رہا ہے اسے طے کر لیجیے، بحث بدلنا شان عقلا نہیں، اس میں مباحثہ سے اجتناب ہو تو اتنا ہی لکھ دیجیے کہ یہ مسئلہ طے ہو لیا، پھر کل سے جس مسئلہ میں چاہیں بحث فرمائیں۔ یہ کیوں کر ممکن کہ جس امر کی غرض سے مناظرہ منعقد ہوا اسے بالکل ناتمام چھوڑ کر ایک اجنبی بات چھیڑ دی جائے۔

یا للمنصفین! اگر ایسا جائز ہو تو ہر جاہل اجہل، ہر فاضل اجل کو عاجز کر سکتا ہے۔ ایک بات میں بحث ہو، جب طور اپنی طرف بُرے نظر آئیں صاف اس سے کنارہ کش ہو کر اور بات پیش کر دے، مقابل پر اس کا جواب واجب، اگلی بحث دفعۃً غائب اسی طرح عمر بھر تبدیلیں کرے، آخر کہاں تک، تھکے گا تو وہی تھکے گا نہ یہ۔ غرض اس مضمون کو طرح طرح لکھ کر جواب چاہا، وہاں وہی حال رہا کہ کبھی اپنی اس حرکت پر نادم، کبھی پھر اسی چال پر قائم، آخر بمجبوری خاص ملا سنبھلی صاحب کے نام نامہ نامی امضا فرمایا کہ حضرت وقت ضائع ہوتا ہے دیر نہ کیجیے، آیئے ہم اور آپ اپنے فرض منصبی کو ادا کریں، آج تیسرا دن ہے کہ ہماری طرف سے تحریر علمی جا چکی۔ جواب کا انتظار ہے، اب کوئی مرحلہ باقی نہیں۔ سوا اس کے کہ پاسخ عطا ہو یا اقرار خطا ہو، وحسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ اس مضمون کا رقعہ پہنچ کر امید واثق تھی کہ ملا صاحب بذات خود شاید اس قسم کی بے اعتدالیاں پسند نہ فرمائیں، مگر حضرت نے تو سب سے بڑھ کر کارگزاری کی، رقعہ پیشیں میں جس قدر تہذیب و حق پسندی کے مرحلے پڑھے گئے تھے شاید حضرت کی تصریحات و تلویحات نے کچھ ہی اٹھا رکھے ہوں، اور اپنے اساتذہ کی شان میں بے ادبی، آقایان نعمت سے سرتابی، علاوہ اور کلمات غیظ و غضب و شتم و سب، وافترائے باطل و مہملات

لاطائل کی تو شکایت ہی نہیں کہ یہ کچھ آج نئی نہیں، ہمیشہ اہل حق اپنے مخالفوں سے یہی صلہ پاتے رہے ہیں، مگر سب سے زیادہ مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس جواب میں صاف کانوں پر ہاتھ دھر گئے کہ نہ مجھے مناظرہ منظور، نہ میں مناظرہ کے لیے آیا، اب حضرت سے کون کہے کہ حضرات بریلی نے خدا جانے آپ کو کیوں بلایا، اور آپ نے نوکری سے بمشکل رخصت لے کر اتنا بڑا عزم کاہے پر فرمایا، اور آپ تو اس ہنگامہ سے بالکل جدا تھے، پھر آپ کے تشریف لے جاتے ہی سب لوہے ٹھنڈے کیوں ہو گئے، آپ کا ریل میں قدم رکھنا اور ادھر سے نامہ و پیام یکسر مسدود ہو جانا، اور لطف یہ ہے کہ خود ہی بعنایت الٰہی اسی رقعہ کے آخر میں وہ لفظ لکھ دیئے جن سے حق کھل گیا، اور صاف ظاہر ہو گیا کہ حضرت اسی قصد سے آئے تھے اور اسے ناتمام چھوڑے جاتے ہیں۔ غرض بارہ بجے یہ رقعہ بھیج کر بے انتظار جواب چار بجے کی ریل میں یہ جاوہ جا، سیدھا بدایوں کا رستہ لیا ﴿إنا لِلّٰہِ وإنا إلیہ راجعون﴾

بعض حضرات پہلے ہی چل دیئے تھے، بعض ہمراہ گئے، دم کے دم میں بحول وقوت ربانی صاف میدان، بالکل سنسان، ہو کا مقام، تر کی تمام، والحمد للہ ذی الجلال والاکرام، حضرات نے تو زبانی جمع خرچ پر ابھارا بھی تھا، یہاں نہ تحریری نہ تقریری، نرے انکار کی ٹھہری، یہ بارہ دن کا زمانہ صرف اوڑان کھائیوں میں بسر ہوا، ایک تحریر علمی گئی تھی جس پر سارا مجمع ہی تیرہ تین نظر آیا، اب جواب کون دے اور مناظرہ کون کرے۔ ﴿قُلْ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا﴾ (۱) بعض احباب نے اس فتح اہل سنت کی ایک نفیس تاریخ حدیث صحیح سے اقتباس کی الحمد للّٰہ الذي أیّد عبدہ۔ وقوّی جندہ۔ وہزم الاحزاب وحدہ ۔۱۳۰۰ھ

تنبیہ نبیہ: نہایت ضرور ملحوظ خاطر رہے کہ بحمد اللہ ہماری نگاہوں میں اس واقعہ کی کچھ ایسی قدر و وقعت نہ تھی نہ ہے جسے مشتہر کر کے معاذ اللہ اپنا ذریعہ فخر ٹھہراتے، بلکہ سچ پوچھیے تو حضرات مناظرین کے لیے موجب فخر ہوتا کہ اگرچہ حملہ اولین میں گریز فرمایا مگر ہزار آفرین کہ ہمت کر کے ایک اسد اغیر، ضیغم صفدر کے مقابل تو گئے، ہاں اس کا انتظار تھا کہ شاید حضرات حسب عادت بد مذہباں بعد مغلوبی بھی بزور زبان اپنا غلبہ چھپوا دیں، اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ

---

(۱) [سورۂ بنی اسرائیل: ۸۱] اور فرماؤ کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا بے شک باطل کو مٹنا ہی تھا۔

تمام تحریرات طرفین کہ اب تک موجود ومحفوظ ہیں طبع کی جائیں گی جنہیں دیکھ کر ہر شخص خود ہی سمجھ لے گا کہ: ع: خاتمہ اس واقعہ کا کیا ہوا کیوں کر ہوا

اب کہ حضرات نے بحمد اللہ شرم سکوت اختیار فرمائی تو ادھر کیا ضرورت تھی۔ الحق اس واقعہ میں حضرات کی دوبار انصاف پرستی کبھی ہمارے دل سے محو نہ ہوگی۔ ایک تو وہ وقت جب سوال ہوا تھا کہ یکہ ناز کے مقابل تم میں کوئی فاضل تنہا تشریف لے جائیں گے، تو صاف فرمادیا کہ ہم میں اتنا کوئی نہیں۔ دوسرے مغلوبی کے بعد خاموشی کہ ہمارے نزدیک یہ چپ رہنا بھی حق پسندی کی خبریں کہہ رہا ہے۔ ورنہ انسان گرم چوٹ میں کیا کچھ نہیں کر گزرتا، ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اس نیک اطواری کے بعد ہمیں بھی فاعف عنهم واصفح پر عمل کرنا تھا، اور ایسا ہی ہم نے کیا۔ مگر معلوم ہوا کہ اس زمانہ میں مخدومنا ومکرمنا خادم الفقرا محبّ العلما رئیس فقیر مشرب فقیر ریاست منصب جناب مولوی غلام شبر صاحب قادری چشتی ابوالحسینی بدایونی أدام اللہ مجدھم العالی نے پرچہ مبادی معہ ان شرائط کے جو بعد تصفیہ چند امور کے لکھے گئے تھے چھپوایا اور اس مناظرہ کا حال بہ نہایت اجمال تحریر فرمایا، جس سے ناظرین کو خواہ مخواہ شوق پیدا ہو کہ کچھ بھی تفصیل کھلی تو اچھا ہو، مع ہذا بدیں سبب کہ وہ تحریرات طبع نہ ہوئیں، حاضرین کے سوا کسی کو اس واقعہ کا پورا حال معلوم نہیں، نہ ان عمدہ تہذیبوں پر اطلاع ہے جو حضرات مناظرین نے اس مکابرہ مناظرہ نما میں کیں، لہٰذا برادران دینی کی خیر خواہی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اس بارے میں چند امر تنبیہ ضرور تا کہ آئندہ اس قسم کی باتوں کا ارتکاب نہ ہو، تعصب کے ہاتھوں تہذیب کی مٹی خراب نہ ہو، ورنہ معاذ اللہ مناظرہ کا نام بدنام کرنے سے کیا حاصل۔ وماعلینا الا البلاغ المبین والحمد للہ رب العالمین۔

ملتمسات ضروریہ

اولاً: فرمایا گیا تھا اور عرض کیا جاتا ہے کہ یہ معاملہ دینی ہے اس میں ناقصین وقاصرین کے سر ٹیکا رکھنا تحقیق حق سے کنارہ گزینی ہے کہ نہ ان سے حصول مقصود، نہ امید بہبود، نہ انہیں تحریراً وتقریراً ہر طور کی بے تہذیبی سے عار، نہ ان کی مغلوبی سے کچھ اثر یا کشود کار، کہ ہر شخص کہہ سکتا ہے یہ کون تھے جن کی شکست شکست ٹھہری، حضرات نے بھی مہربانی فرما کر وعدہ کیا تھا کہ حتی الامکان حضرت مولانا مدظلہ کے مقابل کوئی فاضل ہی پیش کریں گے، مگر بالآخر تاج المناظرین ٹھہرے تو ایک

صاحبزادے کافیہ خواں، ہم امیدوار کہ اگر تحقیق حق چاہیے تو بازیچۂ اطفال کی کیا ضرورت؟

ثانیاً: حضرت مولانا مدظلہ نے دو صورتیں ارشاد فرمائی تھیں، یا تو یہ کیجیے کہ جو عالم ان سب حضرات مجتمعین میں زیادہ علم و لیاقت اور فن مناظرہ میں عمدہ مہارت رکھتے ہوں، جس طرح فقیر ادھر تنہا ہے اور سوا اپنے رب قدیر جل مجدہ اور اس کے نبی کریم علیہ افضل الصلاۃ و التسلیم کے دوسرے کی مدد نہیں چاہتا، وہ بھی صرف اپنی دوش ہمت پر اعبائے مباحثہ کا تحمل فرمائیں اور دلیرانہ یک تاز کے مقابل یکتا و تنہا بر سر جولاں آئیں۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو اور کسی وجہ سے ہمم عالیہ اس کی مساعدت نہ کریں بلکہ ایک کے مقابل دس بارہ آراتی مجمعہ سے چالشکری فرمائیں تو بسم اللہ فقیر یوں بھی حاضر، اس صورت میں ضرور ہوگا کہ تحریر میں اصل نام تو ان فاضل کا ہو جو اس کام کے لیے منتخب کیے جائیں، باقی جتنے صاحب مدد و عون ہوں سب براہ دیانت و امانت ان کی تحریر پر دستخط کر دیا کریں، یا پہلے ہی ایک اقرار نامہ اس مضمون کا رقم فرمائیں کہ فلاں فاضل کی مغلوبی بعینہ ہماری مغلوبی ہے، حضور اقدس سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: الخراج بالضمان۔(۱) سیدنا وابن سیدنا امام ابن الامام حضرت سیدنا حسن مجتبیٰ

---

(۱) عن أم المؤمنين عائشة الصديقة رضي الله تعالى عنها أن رجلاً اشترىٰ عبداً فاستغلّه ثم وجد به عيباً فرده، فقال: يا رسول الله! انه قد استغلّ غلامي، فقال رسول الله صلى الله تعالى عليه وسلم: الخراج بالضمان۔ [سنن ابن ماجه، كتاب التجارات، باب الخراج بالضمان، ۲۲۴۳]

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت ہے کہ ایک مرد نے غلام خریدا اور اس کو کرایہ پر دے دیا۔ پھر اس میں عیب نظر آیا تو اس نے بائع کو واپس کر دیا، تو یہ بائع شکایت لے کر آیا اور بولا: یا رسول اللہ! اس نے تو میرے غلام کو کرایہ پر دے کر فائدہ کمایا ہے، اس پر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ضامن ہونے کے سبب منفعت کا حق دار مشتری ہی ہے۔

مسئلہ کی صورت یہ ہوگی کہ کسی شخص نے غلام خریدا اور اس کے پاس چند دن رہا، ان دنوں میں غلام کے ذریعہ مشتری نے کچھ مالی منفعت حاصل کی، پھر اس میں کوئی عیب نظر آیا۔ یا مشتری کو شرط خیار حاصل تھا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں کسی وجہ سے اس نے بائع کو واپس کر دیا تو اس غلام کی اتنے دن کی کمائی مشتری کی ہوگی، کیوں کہ ان ایام میں اگر غلام فوت ہو جاتا تو یہ نقصان مشتری کا ہوتا، اس لیے کہ یہ مشتری کی ضمانت میں تھا، تو اس ضمانت اور ذمہ داری کی بدولت غلام کی اجرت کا حق دار یہ مشتری ہی ہوگا۔

لہٰذا یہاں شرکائے مناظرہ اپنے آپ کو مناظرین کی صف میں شمار کرانا چاہتے ہیں تو دستخط کر کے اس بات کی ضمانت دیں کہ مناظر کی مغلوبی اور شکست ہماری بھی شکست مانی جائے گی۔

رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں: وَلِّ حَارَّها مَن تولّی قارَّها۔ (۲) یہ کیا، وہ سب صاحب مدد دینے رائے لگانے کے لطف تو اٹھائیں، اور اگر بحول اللہ وقوتہ حق اس طرف ظاہر ہو تو مغلوبی ومجوبی کے نام سے صاف بچ جائیں، ان دونوں صورتوں میں جو شکل حضرات کو بہت پسند اور ان کے لیے زیادہ آرام بخش وراحت مند ہو اسے اختیار فرما کر فقیر کو اطلاع دیں کہ پھر شرائط ومبادی میں کلام ہو کر انشاء اللہ تعالیٰ مناظرہ شروع ہو۔ ولا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ العزیز الحکیم.

انتہی ملتقطا: اس نامہ نامی کے جواب میں حضرات نے نہایت انصاف دہی کو کام فرما کر صریح اقرار کر دیا کہ شق ثانی رقعہ والا کی منظور۔ یعنی ہم میں کوئی تنہا آپ کے مقابل نہ آئے گا، جو کچھ تحریر ہوگا سب کے مشورے سے لکھا جائے گا۔ مگر اس شق پر جو کچھ فرمایا گیا اس کا مطلق جواب نہیں، پھر بتقاضا قبول کیا تو اس پر عمل نہ ہوا۔ کما یظھر بالرجوع إلی التحریرات.

اب بھی ہم تمام حضرات مفصلہ ہندوستان کو اجازت قطعی دیتے ہیں کہ حضرت مولانا مدظلہ العالی کے مقابل ایک سے لے کر سو تک جمع ہو جائیں۔ انشاء اللہ تعالیٰ ادھر کچھ پروا نہیں، مگر اس تقدیر پر جو امر لازم کیا گیا تھا اس سے عدول جائز نہ ہوگا، اور اس کی ضرورت صرف قصر مساحت کی غرض سے ہے کہ آج دس بیس حضرات نے جمع ہو کر ایک کو مقدم رکھا اور در پردہ سب کا مشورہ ہوا، جب بعنایت الٰہی مغلوبی پائی دوسرے کو سامنے کر دیا، اور پھر سب اس کے شریک حال رہے، یوں تو سلسلہ غیر متناہی ہے، ایک ایک سے کہاں تک الجھیں، بہتر یہ ہے کہ سب دفعۃً سمجھ لیں۔ حسبنا اللّٰہ ونعم الوکیل ولا حول ولا قوۃ إلا باللّٰہ العلي العظیم.

ثالثاً: تا وقتے کہ مسئلہ دائرہ طے نہ ہو جائے تبدیل بحث کسی عاقل کے نزدیک روا نہیں، وھذا ظاھر جدًّا!

(۲) [سنن ابی داود، کتاب الحدود، باب فی الحد فی الخمر: ۴۴۸۱]

ترجمہ: جس نے خلافت اور حکومت کی ذمہ داری اپنی پسند سے قبول کی تو اس کی شدت اور سختی برداشت کرنے کے لیے بھی مستعد رہے۔

یہ ایک مثل ہے جس کا مطلب ہے: کسی کام کو نفع بخش جان کر اختیار کرو تو اس کے مصائب برداشت کرنے کے لیے بھی تیار رہو۔

رابعاً: اس مسئلہ میں اہل زمانہ کے مسالک نہایت مختلف لہذا جو صاحب قصد مناظرہ فرمائیں انہیں اپنے دعوے کا ایضاح ضرور کہ اسی پر تو پر ان سے بحث ہو اور ہمارا عقیدہ تو بحمد اللہ منطبع ہو چکا، اور انشاء اللہ تعالیٰ پھر ہوگا جو صاحب چاہیں ملاحظہ فرمائیں۔

خامساً: تصفیہ مبادی۔

سادساً: ہم ہر طرح تحریر پسند کرتے ہیں کہ تقریر میں احتمال شور وغوغا وشر وفتنہ بیشتر، اور کہہ کر پلٹ جانے کی مجال اکثر واوفر، پھر اگر صبر کیجیے تو مخالف کو ہر جگہ پہلو بدلنے کا موقع اور ان کروڑوں میں بحث کی کل ٹھیک بیٹھنا غیر متوقع، اور بگڑے جھگڑے تو اصل مطلب کوسوں گیا، گفتم نگفتم میں جھگڑا آپڑا، معہذا مشاہدہ مجرب کہ تقریر کا مآل اکثر ملال، جہاں گفتگو مزے پر آئی اور ایک فریق نے اپنی بگڑتی پائی، لیجیے چہرہ سرخ آنکھیں لال، تہذیب بے چاری کو جینا وبال، بخلاف تحریر کہ وہاں شرم تشہیر غالباً دامنگیر، اور سلطان غضب بہ نسبت قلم کے زبان پر زیادہ قدیر، اور اس کی وجہ عجلت وخفت ہے جسے مقتضائے عقل سے قطعی مخالفت ہے، اور یہ چوتھی وجہ ہے:

فإن التأني من الرحمن والعجلة من الشيطان.

مع ہذا تقریر وقت کے وقت ختم ہو جاتی ہے، تحریر ہمیشہ اپنا لطف دکھاتی ہے، مناظرین نہ سمجھے تو ناظرین سمجھیں گے، جو بیچ نفسانیت میں الجھے رہے انسانیت میں سلجھیں گے، بایں ہمہ مغلوبی کے بعد یہاں وار انکار مسدود، اور کوئی جرأت کرے بھی تو مکذب موجود، علاوہ بریں تحریر علمی خصوصاً حریف کے آگے علم کی معیار ہے، زبانی زق کا ہر قاصر کم علم وناقص کج فہم کو اختیار ہے۔ ان سات وجوہ سے ہم ہمیشہ ہر مسئلہ میں ہر معاملہ میں تحریر کو بہتر مانتے ہیں اور ٹھیک انکشاف حق وانزہاق باطل کو اسی میں منحصر جانتے ہیں وباللّٰہ التوفیق وبیدہ ازمۃ التحقیق

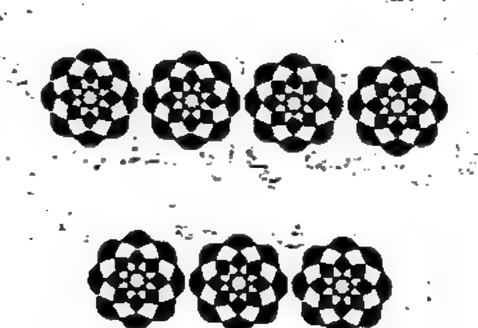
آمدم بر سر مطلب

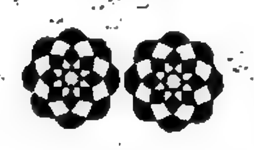
ان سب امور پر اطلاع عام دے کر حضرات مفضلہ بریلی وبدایوں سے خصوصاً اور تمام تفضیلہ ہندوستان سے عموماً دوستانہ گزارش کی جاتی ہے کہ جن صاحب کو تحقیق حق کی ہواسر میں ہو بسم اللہ عالی ہمتی کو کام میں لائیں، اور بلحاظ جملہ امور معروضہ سابق ولاحق والاحضرت چشم وچراغ دودمان فضیلت استاذنا وملاذنا جناب مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب محمدی سنی حنفی

قادری برکاتی احمدی بریلوی دام بالمجد العلی والفضل الوفی سے مناظرہ فرمائیں۔ نتیجہ یہ کہ ان شاء اللہ تعالیٰ اختلاف دفع اور عوام کا تردد رفع ہو۔ واللہ الهادي إلى سواء السبيل وحسبنا الله ونعم الوكيل ولاحول ولاقوة إلا بالله العلي العظيم وصلى الله تعالى على خير خلقه وسراج افقه هذا النبي الكريم وآله الكرام وصحبه العظام إلى يوم القيام آمين برحمتك يا أرحم الراحمين۔

الراقم فقیر محمد شاہ خان قادری قاضی بریلوی غفر الله له ذنبه الخفي والجلي آمين یازدہم ذوالقعدہ یوم الجمعة ۱۳۰۰ھ على صاحبها التحيه آمين۔

یہ کتاب بہ فرمائش مولوی غلام شبر صاحب چھاپی گئی اور مہر جماعت ثبت کی گئی۔ بلا مہر مردود خیال کی جائے گی۔ فقط





﴿فہرست کتاب﴾

ہماری دیگر مطبوعات

